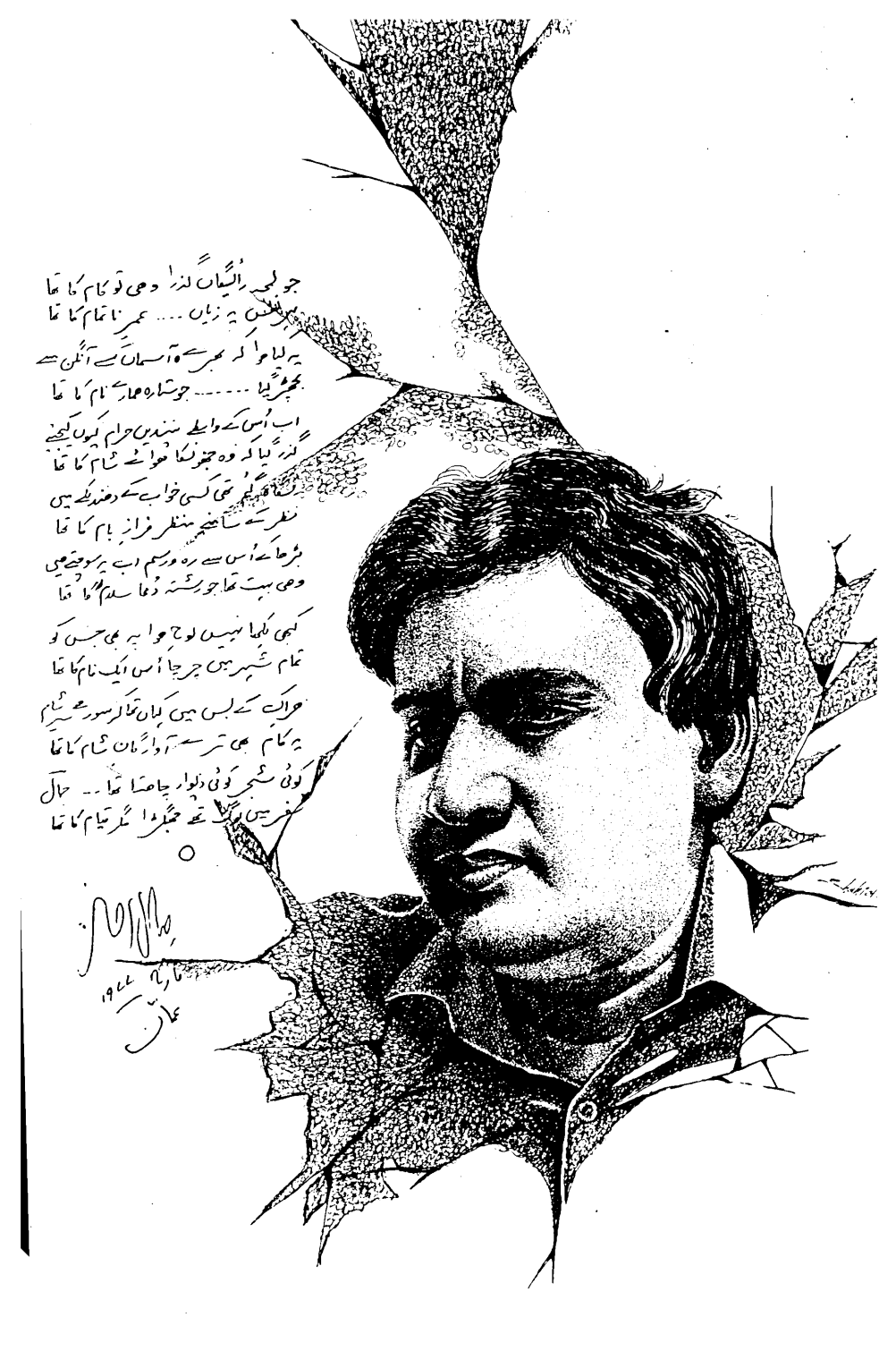

جو لمحہ رائیگاں گزرا وہی تو کام کا تھا
ہر اک نفس پہ زیاں .... عمر ناتمام کا تھا

یہ کیا ہوا کہ بھرے آسماں کے آنگن سے
بچھڑ گیا ...... جو ستارہ ہمارے نام کا تھا

اب اس کے واسطے نیندیں حرام کیوں کیجے
گزر گیا کہ وہ جھونکا ہوائے شام کا تھا

نگاہ کہ گم تھی کسی خواب کے دھندلکے میں
نظر کے سامنے منظر فراز بام کا تھا

بڑھا کے اس سے رہ و رسم اب یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا جو رشتہ دعا سلام کا تھا

کہیں لکھا نہیں لوحِ ہوا پہ بھی جس کو
تمام شہر میں چرچا اسی ایک نام کا تھا

ہوا کے بس میں کہاں تھا کہ سورجِ سرِ شام
یہ کام بھی ترے آوارگانِ شام کا تھا

کوئی شئے کوئی دیوار چاہتا تھا .. جمال
سفر میں لوگ تھے جھگڑا مگر قیام کا تھا

○

احمد فراز
۲۹ مارچ ۱۹۸۸
عمان

شاعرِ غزل

ڈاکٹر ساجد امجد

تمام اسبابِ خاک و آب کو اب ڈھونے والا ہے
ترا مہمان چند لمحوں میں رخصت ہونے والا ہے
یہاں حیثیتِ انساں اگر کچھ ہے تو اتنی ہے
ابھی یہ سو کر اُٹھا ہے، ابھی پھر سونے والا ہے

ستر کے عشرے میں جدید اُردو غزل کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑے ہونے والے نوجوان شعراء میں اس کا نام سرِفہرست ہے۔ حالاں کہ یہ وہ دَور تھا جب نثری شاعری کی تحریک زوروں پر تھی اور ہر نو وارد ادب اس نئی صنفِ سخن کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ نثری شاعری فیشن بنتی جا رہی تھی شاعری کے مروجہ سانچوں کو بدلنے پر زور دیا جا رہا تھا اور غزل خصوصی طور پر ہدفِ تنقید و ملامت تھی۔ ایسے وقت میں اُس نے غزل کو اپنا کر اپنی شاعرانہ حیثیت کو تسلیم کرایا وہ اپنی پوری زندگی میں اوّل و آخر شاعر ہی تھا۔ شاعر کی زندگی جیا اور شاعر کی موت ہی پائی۔

اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے اُس نے لکھا تھا "میں جتنا کتنا بھی ہوں، اپنی شاعری کے سبب ہوں اور جو کچھ میں نہیں ہوں، اُس کا سبب بھی میری شاعری ہے۔ شاعری دراصل میری جزا بھی ہے اور سزا بھی۔ یہ میرا انعام بھی ہے اور دشنام بھی۔ میری فتح بھی شاعری کی مرہونِ منّت ہے اور میری شکست کے پردے میں بھی میری شاعری ہی کارفرما ہے۔ اس نے مجھے عزّت بھی دی اور رُسوائی بھی۔ اس کے ذریعے لوگ مُجھ سے خوش بھی ہیں اور ناخوش بھی۔ میں نے شاعری ہی سے دُنیا برتنے کا فن سیکھا اور میری بے ڈھنگی زندگی، میری شاعری ہی سے وجود میں آئی ہے۔"

اُردو زبان کے شعری ادب کا منفرد نام مشہور شاعر جمال احسانی کی سرگزشت

سُلگتی دوپہروں، اندھیری راتوں اور شام ہوتے ہی سنائی دینے والی خاموشی کے سوا کورنگی کے ابتدائی دنوں میں دھرا ہی کیا تھا۔

ریت کے ٹیلوں، کھلے میدانوں اور خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک ایک کمرے کے مکانات۔ یہ تھی کل کائنات۔

نہ اسکول، نہ کالج، نہ بازار، نہ کاروبار۔ یہ تھی ایک بستی جو زمین پر آباد کرکے آسمان کے سُپرد کردی گئی تھی۔ شہر کی گہما گہمی سے دور۔ صحرا میں پھول، جنگل میں مور کہ ناچے تو خود ہی تماشا خود ہی تماشائی۔

دن نکلتے ہی خلقت کی خلقت شہر کی طرف دُھلنے لگتی تھی کہ کاروبار وہیں تھا، درس گاہیں وہیں تھیں۔ شہر میں روشنیاں جلتی تھیں تو یہاں کے باسی اندھیروں کی طرف لوٹ آتے تھے کہ اب یہی ان کی پناہ گاہ تھی۔ گھروں میں لالٹینوں کے جگنو چمکتے تھے۔ چاندنی راتوں میں بچے کوڑا جمال شاہی کھیلتے تھے۔ چھپّروالے ہوٹل تھے جن میں پڑی چارپائیوں اور لکڑی کے بینچوں پر بیٹھ کر نوجوان گپ شپ میں وقت گزارا کرتے تھے۔

اس نواحی بستی میں سماجی تقریبات کے نام پر قوالیوں اور مشاعروں کا رواج تھا یا پھر کسی مولوی کو بلا کر وعظ کرالیا جاتا تھا۔ شعری نشستوں کی خاص طور پر کثرت تھی کہ یہی ایک سستی تفریح تھی۔ مقامی شعرا روایتی شاعری سے ماحول کو گرما رہے تھے۔ کبھی کبھی شہر کا کوئی شاعر ان نشستوں میں آنکلتا تو گلیوں میں شور مچ جاتا تھا کہ شہر کے شاعر آرہے ہیں۔

○☆○

کراچی شہر سے پندرہ بیس کلو میٹر کی دوری پر آباد ہونے والی

اس بستی کی عمر آٹھ سال آگے بڑھ گئی تھی۔

لال ٹینوں کے جگنو برقی قمقموں میں تبدیل ہو گئے۔ سڑکیں تعمیر ہوئیں' اسکول کھلے' مارکیٹیں بن گئیں۔ ریت کے ٹیلے جاتے رہے' خود رو جھاڑیاں نابود ہو گئیں۔ ویرانے میں چپکے سے بہار آگئی مگر یہ بہار شہر کے گل زاروں سے کچھ مختلف تھی۔ یہی اس کی شناخت تھی' یہی انفرادیت۔

بستی کی عمر بڑھی تو بستی کے بچے بھی جوان ہوئے۔ ان آٹھ برسوں میں میری عمر بھی بارہ سے بیس ہو گئی۔ یہ فاصلہ خاموشی سے طے نہیں ہوا' آوارگی کی راتوں اور ہنگاموں کے دنوں کی ہمراہی میں طے ہوا۔ ہوش سنبھالتے ہی شعری نشستوں میں بیٹھنے لگا۔ طبیعت کی انتہا پسندی نے اس کوچے کی ایسی خاک چھانی کہ دیوانہ گھر کا رستہ بھول گیا۔ دوسرے تیسرے دن کبھی گھر چلا جاتا ورنہ دوست' ہوٹل اور مشاعرے۔ ان دنوں میں نے نوکری کرلی تھی لیکن سرکاری نوکری تھی لہٰذا کبھی دفتر چلا گیا اکثر نہیں گیا۔ پیدل چلنے کا خبط تھا لہٰذا کورنگی کے ہر علاقے میں صورت آشنا موجود تھے۔ ان دنوں رات رات بھر ہوٹل کھلنے کا دستور سا تھا اور میں تو "شہزادۂ شب" کہلاتا تھا۔ ان میں سے اکثر ہوٹل میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دوستوں اور ان کے قہقہوں سے آباد ہوتے تھے۔ جب بسیں بند ہوجاتیں' ٹریفک کم ہوجاتا تو ہم میلوں پیدل چلتے تھے.... فی البدیہہ شعر کہے جاتے' لطیفے سنائے جاتے' ترنم کے مقابلے ہوتے' تھک جاتے تو ایک ایک دوست کو اس کے گھر چھوڑ کر' میں رات کے آخری پہر میں اپنے گھر لوٹ آتا۔

طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے لہٰذا ایک مشاعرے سے دوسرے مشاعرے تک مصروفیت برقرار رہتی۔ طرح میں شعر نکالے جاتے' رازداروں کو سنائے جاتے۔ بحثیں ہوتیں۔ قافیے چرانے پر لڑائیاں تک ہو جاتی تھیں۔ مضمون ٹکرا جائے تو شاعر سر ٹکرانے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ دو غزلیں کہی جاتی تھیں۔ دوستوں کو سنانے کے لیے الگ اور مشاعرے میں پڑھنے کے لیے الگ تاکہ چوری کا امکان کم سے کم ہو جائے۔

○☆○

۱۹۶۹ء کا کوئی اتوار تھا۔ کورنگی نمبر ۲ کے مکان میں ایک مشاعرہ تھا۔ چھٹی کا دن تھا لہٰذا مشاعرے کا وقت تین بجے سہ پہر مقرر کیا گیا تھا۔ "مشاعرہ بر مکان فلاں" کا دعوت نامہ ایک دن پہلے ہی موصول ہوا تھا۔ اتفاق سے غیر طرحی مشاعرہ تھا اس لیے چپڑی اور دودو والا محاورہ صادق آرہا تھا۔ بہت دن بعد اپنی پسند کی غزل پڑھنے کا موقع مل رہا تھا۔

میں اپنے دوستوں کے قافلے کے ساتھ پتا ڈھونڈتے ہوئے مشاعرے والے مکان تک پہنچا۔ گلی میں کھلنے والے دروازے کے باہر جوتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اچھے خاصے شعرا آچکے ہیں۔ واضح رہے کہ مضافات کے ان مشاعروں میں سامعین بھی شعرا خود ہی ہوتے تھے۔

اس بستی کے لاتعداد شعرا میں صہبا اختر' رسا چغتائی' مجیب خیر آبادی' جوہر سعیدی' علیم محشر چھتاروی' انجم فوقی بدایونی چند بڑے نام تھے جن سے ہم نوجوان بہت کچھ سیکھتے تھے۔

ہم پہنچے تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ صدارت بےتاب نظیری کر رہے تھے جو "علامہ" کہلاتے تھے۔ نظامت کے فرائض شاہد الوری انجام دے رہے تھے۔ میں نے نشست سنبھال کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اور چہروں کے علاوہ رسا چغتائی' شکیل احمد رضا اور تقی دہلوی بیٹھے نظر آئے۔ جان میں جان آئی کہ اب غزل سنانے کا لطف آئے گا۔

میرے ابتدائی دوستوں میں سلیم زیدی' محسن اسرار' شفق زیدی (اب اشفاق حسین ہے اور کینیڈا میں مقیم ہے) وغیرہ تھے۔ وہ بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ شفق تو خیر نووارد تھا لیکن مجھے اور سلیم زیدی کو مشاعروں میں شرکت کرتے تین سال ہو چکے تھے۔

مشاعرہ شباب پر تھا۔ مجھ سمیت بہت سے شعرا پڑھ چکے تھے کہ اچانک اٹھارہ انیس سال کا ایک لڑکا تیزی سے داخل ہوا' شاہد الوری کے کان میں کچھ کہا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا ہوگا کوئی' غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

"یہ صاحب زادے پڑھنا چاہتے ہیں۔ کیا خیال ہے پڑھوا دوں؟" شاہد الوری نے مجھ سے پوچھا۔

"مقام تو گزر چکا' آگے آپ کی مرضی۔"

"پڑھنے دے یار۔ کیا یاد کرے گا۔" شاہد الوری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور چپکے سے ایک گالی بھی بک دی۔

میں نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ وہ لڑکا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ اسے پڑھوایا جائے گا۔

"اب تشریف لاتے ہیں جمال پانی پتی۔" شاہد الوری نے اعلان کیا۔ وہ لڑکا بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اب میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سب سے پہلے جس چیز نے مجھے چونکایا وہ اس کا لباس تھا۔ سفید پینٹ' سفید شرٹ اور وی کالر کا سفید سوئٹر۔ وہی جو کرکٹ کے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ وہ بھی شاید کرکٹ کھیلتے کھیلتے ادھر آگیا تھا۔ گیند رگڑنے کے... سرخ نشان ابھی تک اس کی پتلون پر نظر آرہے تھے۔ دبلا پتلا جسم' تیکھے نقوش جن میں اس کی ستواں ناک اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ باریک لب' کتابی چہرہ' آنکھیں چھوٹی بے حد کٹیلی اور شرارتی' رنگ گہرا سانولا۔ چھریرے بدن پر اس کے چوڑے شانے بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔

"جمال پانی پتی تو شہر کے ایک شاعر ہیں۔" میں نے شاہد الوری کے کان میں کہا۔

"ابے تو کلام کون سا اس کا اپنا ہوگا۔ کرکٹ کھیلتے ہوئے

یہاں آگئے سالے۔"

میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مقطع پڑھ رہا تھا۔

پوجا بھی ان کو، سجدے بھی ان کو کیے جمالؔ
کافر کبھی کبھی تو مسلماں کبھی کبھی

شعر پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی سے کہہ کر آیا ہو کہ جب تک تم بولنگ کراؤ، میں ابھی آیا۔ جلدی جلدی غزل ختم کی۔ جس طرح لپاک جھپاک آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ غزل پڑھ کر کچھ دیر بیٹھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

یہ اس کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اس وقت وہ جمال پانی پتی اور میں ساجد رام پوری تھا۔

مشاعرہ ختم ہونے تک وہ میرے ذہن سے اتر چکا تھا۔ ہر مشاعرے میں گلی کا ایک آدھ شوقین شاعر متعارف ہوتا تھا۔ کون کس کو یاد رکھتا ہے۔ اس نے کوئی ایسا تاثر چھوڑا بھی نہیں تھا کہ میں اسے یاد رکھتا۔

کورنگی سوکوارٹر کے علاقے میں مشاعرہ تھا۔ اس لڑکے کو میں نے وہاں دیکھا۔ وہ اب بھی جمال پانی پتی تھا۔ اب مجھ سے نہیں رہا گیا۔ وہ غزل پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا تو میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"تم جمال پانی پتی ہو؟"

"ہاں اور تم ساجد رام پوری۔ میں نے تمہارا نام سنا ہوا ہے۔"

"سنا ہوگا۔" میں نے بے نیازی سے کہا "تمہیں معلوم ہے شہر میں ایک شاعر ہیں، ان کا نام بھی جمال پانی پتی ہے؟"

"تو؟"

"تو یہ کہ تم اپنا نام بدل لو۔ پورے کا پورا نام وہی ہے، یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔" اس نے کہا اور چپ ہو گیا۔

اب غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا نام اختیار کرے۔ اس کے علم میں نہیں تھا کہ اس کا ہم نام کوئی اور بھی ہے۔ میں نے توجہ دلائی تو وہ پریشان ہو گیا۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر کہیں بیٹھ گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ میں صدر میں، کورنگی کے بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا کہ وہ سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ جھومتا ہوا چلتا تھا مگر اس وقت لنگڑا رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور شاید اسی لیے اس کے پاؤں میں جوتے نہیں، چپل تھے۔ دھوپ کا نہایت قیمتی چشمہ آنکھوں پر لگا ہوا تھا۔ کپڑے تو وہ ہمیشہ شاندار پہنتا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر اپنائیت کی سرخی ابھر آئی۔ میں نے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے بازو پھیلا دیے اور مجھ سے لپٹ گیا۔ دو چار سرسری سی ملاقاتوں کے پس منظر میں اس کی یہ وارفتگی مجھے حیران کر گئی۔ یہ ہنر اس میں کمال کا تھا جو نظر کو جچ جاتا تھا اسے سینے میں اتار لیتا تھا۔ دوست خریدنے کے لیے اس کی جیب میں خلوص کے سکے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

سوانحی خاکہ

نام..... محمد جمال عثمانی
ادبی نام..... جمالؔ احسانی
والد..... محمد ظہور عثمانی
والدہ..... اعجاز فاطمہ
بھائی..... بلال، ہلال، مصطفےٰ
بہنیں..... عزیزہ، عظیم، نسیمہ
بیوی..... شہناز
بیٹے..... علی، آذر، ثبات
بیٹی..... حرا جمال
تعلیم..... بی۔اے
پیدائش..... ۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء
وفات..... ۱۰ فروری ۱۹۹۸ء
مولد..... سرگودھا
مدفن..... کراچی
آبائی وطن..... پانی پت

"خیریت ہے؟ یہ پاؤں میں عذر لنگ کیسا؟" میں نے مزاحاً کہا۔

"کچھ نہیں یار۔ آؤ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع ایک ہوٹل میں پہنچ گیا۔

"یار ساجد، میں نے اپنا نام بدل لیا ہے۔" اس نے بیٹھتے ہی اس طرح کہا جیسے وہ یہ خبر سنانے کے لیے کئی دن سے مجھے ڈھونڈ رہا ہو۔

"اب کیا ہو گئے ہے؟"

"جمال احسانی۔"

یہ نام سن کر میں چونکا تھا۔ مجھے احسان دانش یاد آ گئے، ان کے شاگرد بھی اپنے نام کے ساتھ "احسانی" کا لاحقہ لگاتے ہیں۔

"تم احسان دانش کے شاگرد ہو؟"

"نہیں تو۔"

"پھر یہ احسانی کیوں۔"

"اوہ! اچھا۔" وہ زور سے ہنسا "میرے گھر کے قریب ایک شاعر رہتے ہیں۔ احسان امروہوی۔ میں انہیں اپنی غزلیں دکھاتا ہوں۔ بس اسی مناسبت سے احسانی اختیار کر لیا۔ یار، کیا غزل لکھتے ہیں۔ "جاگنا فرض ہو گیا، نیند حرام ہو گئی۔" کمال کے شعر لکھتے ہیں۔"

وہ بہت دیر تک استاد کی شان میں لفظ خرچ کرتا رہا۔ ظاہر ہے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں سنتا رہا، اکتاتا رہا۔

ہماری شاعری کا وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ جہاں بیٹھتے تھے، شعر سننا اور سنانا ضروری ہو جاتا تھا۔ وہ بھی جب اپنے استاد کی کرامات سنا چکا تو

جیب سے ایک کاغذ نکال کر بیٹھ گیا۔

"غزل سن یار' آج ہی کہی ہے۔ ابھی احسان صاحب کو بھی نہیں دکھائی ہے۔"

"چلو ہم دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا۔ موقع ہنسی کا تھا لیکن اس پر تو غزل سنانے کی سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے غزل سنائی۔

جی بھر کے موسموں کے چلن نے ستالیا
نکلا تھا بیج کے دھوپ سے بارش نے جالیا
ناکامیوں سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا
ہم نے ترے حصول کو مقصد بنالیا
آزار بن گئی تھیں میری نیک نامیاں
رسوائیوں کے خول میں خود کو چھپالیا
اس خوف سے' تو دے نہ سکے گا کوئی جواب
ہونٹوں پر آکے رک گیا جملہ سوال کا
ہر شخص نے کنارہ کیا مجھ سے جب جمالؔ
آوارگی نے بڑھ کے گلے لگالیا

یہ اس کی پہلی غزل تھی جو میں نے توجہ سے سنی۔ کورنگی میں اس وقت جس قسم کی شاعری سننے کو مل رہی تھی' یہ غالباً اس سے بہت مختلف تھی۔

اس نے کئی غزلیں اور سنائیں۔ ان سب سے تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ بیچ بیچ میں' میں بھی اشعار سناتا رہا۔

اشعار کے تبادلے نے طول کھینچا تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس دوران میں چائے کے کئی دور چل چکے تھے۔ ہم میں سے کسی ایک نے سوچا ہوگا کہ اب چلنا چاہیے۔ میں نے بل ادا کرنے کے لیے ضد کی لیکن وہ مجھ سے پہلے جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔ یہ فیاضی اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ مجال نہیں تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا پیسے ادا کردے۔ وہ اس طرح جیب جھاڑتا تھا جیسے دنیا بھر کے سرمایہ داروں سے انتقام لے رہا ہو۔ جیب خالی ہوتی تو بھی اسے یہ گوارہ نہ ہوتا کہ کوئی اور اس کی چائے کے پیسے دے۔ اس کے لیے اس نے یہ ترکیب نکالی تھی کہ جس پر خرچ کرنے ہوتے تھے۔ اسی سے قرض مانگ لیتا تھا۔

"یار' ایک دس روپے دینا۔"

"کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"ابے دے تو سہی' ضرورت بھی پتا چل جائے گی۔"

اس کے دس روپے اسی پر خرچ کرکے وہ اٹھتا تو اس کی چال میں عجیب سی تمکنت آجاتی۔ پیسے اپنے ہوں یا پرائے۔ اس کے لیے تو مقام مسرت یہ تھا کہ اس کی جیب میں ہوں اور اس کی جیب سے نکلیں۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو روشنیوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر اس بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے جہاں سے کورنگی کی بس ملتی تھی۔ اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے اس کی مضطرب طبیعت نے پھر ایک کروٹ لی۔

"آؤ' کہیں بیٹھ کر نمکین کھاتے ہیں۔ اس وقت تک بسوں میں رش بھی کم ہو جائے گا۔"

میں ایک مرتبہ پھر اس کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ حضرت مجھ سے بھی زیادہ گھر سے بیزار ہیں پھر وہی شاعری' باتیں اور لطیفے۔

کھانے کے بعد ٹہلنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا لیکن میرے ساتھ دیر تک گھومتا رہا۔ وہ مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرنے کا عادی تھا۔ اب ملاقات ہو گئی تو چاہتا تھا ایک ملاقات کو کئی ملاقاتوں تک پھیلا دے۔ مجھے واقعی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے ساتھ مسلسل کئی دن سے گھوم رہا ہوں۔ ایک دوسرے کے بارے میں جو باتیں ہم کئی ملاقاتوں کے بعد جانتے' ایک ہی ملاقات میں جان گئے تھے۔

اس ملاقات کے بعد مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے ایک بھائی ملک سے باہر ہیں' دو چھوٹے بھائی اور والدہ اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ وہ خود ٹی اینڈ ٹی میں معمولی سی پوسٹ پر ملازم ہے لیکن اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر یقین آجاتا تھا کہ اس کے بڑے بھائی جو ملک سے باہر ہیں' چھوٹے بہن بھائیوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

میری طرح وہ بھی سگریٹ سے سگریٹ جلا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے خالی پیکٹ ہوا میں اچھالا اور سگریٹ لینے کے لیے رکا۔ اس نے میرا برانڈ خریدا۔ میں نے سوچا' میرے لیے خرید رہا ہے۔ میں نے اسے اس فضول خرچی سے روکا۔

"میرے پاس سگریٹ ہیں۔"

"مگر میرے پاس تو ختم ہو گئے ہیں۔"

"تو تم اپنا برانڈ خریدو۔"

"آج سے ہم دونوں ایک ہی برانڈ کے سگریٹ پیا کریں گے۔ سگریٹ مانگ کر پینے میں آسانی رہے گی۔" اس نے کہا اور بات میری سمجھ میں آگئی۔

اتنا چلنے کے بعد اس کی ٹانگ میں تکلیف بڑھنے لگی تھی۔ جب اس نے میرے گلے میں ہاتھ ڈالنے کے بہانے میرا سہارا لیا اور اس کی لنگڑاہٹ میں اضافہ ہو گیا تو مجھے احساس ہوا۔

"شاید تمہارے پاؤں میں تکلیف ہے؟"

"ہاں' اچانک بڑھ گئی۔"

"کیا' ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں' بس ذرا موچ آگئی تھی۔"

"پاؤں میں موچ اور تم اتنا چل لیے۔"

"کیا ہوا یار' ابھی اور چل سکتا ہوں۔ تم ٹھہرے آوارہ گرد۔ آج

مل گئے تو میں نے سوچا تمہارے ساتھ خوب گھوم لوں۔ کیا خبر پھر ملو' نہ ملو۔"

"عجیب بے وقوفی کی اس وقت تم نے۔" میں نے کہا "بس اب مٹرگشت ختم' واپس چلنے کی سوچتے ہیں۔"

اس کے پاؤں کی تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ جیسے تیسے ہم بس اسٹاپ تک آئے اور بس میں سوار ہو گئے۔

کورنگی پہنچتے پہنچتے درد کچھ کم ہوا تو وہ پھر چہکنے لگا۔ اتنا گھومنے کے بعد بھی اس کا جی نہیں بھرا تھا۔

"چلو کیفے دکن چلتے ہیں۔"

"اس وقت کیا تک ہے وہاں جانے کی۔"

"میں نے سنا ہے' رات کو تم وہاں بیٹھتے ہو۔ آج میں بھی بیٹھ لوں گا۔ تمہارے اور دوستوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"تجویز تو اچھی ہے لیکن اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے ورنہ درد بڑھ جائے گا۔"

میں نے بڑی مشکل سے اسے گھر کی طرف روانہ کیا اور خود کیفے دکن پہنچ کر دوستوں میں مصروف ہو گیا۔

اس ملاقات کے بعد میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ میرے ذہن سے اتر جاتا۔ ان دنوں کسی ہم عمر کی شاعری تو کم ہی دل میں اترتی تھی لیکن اس کی سحر انگیز شخصیت میرے دل کے ایک کونے میں جگہ بنا کر اس طرح آباد ہو گئی کہ پھر ایک وقت وہ آیا کہ ہر کونے میں اس کی جلوہ گری تھی۔

میں اس سے متاثر تو تھا لیکن اتنی جلدی ٹوٹنے والا بھی نہیں تھا۔ جمال کا معاملہ دوسرا تھا' اسے دوست بنانے اور دوست بننے کا ہنر آتا تھا۔ میں ذرا دیر آشنا تھا۔ میرے دوست بہت تھے لیکن بہت دیر میں بنتے تھے۔ وہ کتنا ہی جلد باز سہی' میری کاہلی کو اتنی جلدی کیسے شکست دے سکتا تھا۔

میں نے اس کا گھر ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ کورنگی کے علاقے سو کوارٹر میں رہتا ہے۔ وہ جب بھی ملتا تھا گھر چلنے کی ضد کرتا تھا لیکن میں ٹالتا رہتا تھا۔ اب اتنا البتہ ہو گیا تھا کہ مشاعروں میں ہم ایک ساتھ بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگے تھے۔

کورنگی اور لانڈھی کہنے کو دو الگ الگ علاقے ہیں لیکن کورنگی ختم ہوتے ہی لانڈھی شروع ہو جاتا ہے لہٰذا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں جب کورنگی سے لانڈھی منتقل ہو گیا تو وہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔

لانڈھی کا دبستانِ شاعری کورنگی سے بھی زیادہ قدامت پسند واقع ہوا تھا۔ ولی دکنی کے زمانے کے شاعر گویا ابھی تک لانڈھی میں زندہ تھے۔ تخیلاتی عشقیہ شاعری ہو رہی تھی۔ گورو کفن کے قصوں پر مشاعرے لٹ جاتے تھے۔ اس فضا میں نئی بات تو رہی درکنار' نئے لہجے میں بھی اگر کوئی بات کہہ دی جاتی تو سہ غزلہ' چوغزلہ کہنے والے

شعری مجموعے

ستارۂ سفر
رات کے جاگے ہوئے
تارے کو مہتاب کیا (زیرِ طبع)

○☆○

چند مقرب شاعر دوست

ساجد امجد' یاد صدیقی' الیاس شاداں' شاہد الوری' احمد جاوید' فرات رضوی' محسن بھوپالی' عبید اللہ علیم' نصیر ترابی' جون ایلیا' عالم تاب تشنہ' سلیم احمد' اطہر نفیس' جاوید صبا' فاطمہ حسن۔

○☆○

بوڑھے شاعر' رستے گلی میں پکڑ کر سمجھاتے تھے کہ شاعری کیسے کی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض تو اس پر ناراں تھے کہ انہوں نے آج تک اپنی نکالی ہوئی زمین میں شعر نہیں کہے' ہمیشہ طرح میں غزل لکھی۔ طرح میں شعر نکالنے کو وہ استادی سمجھتے تھے۔ شاگردوں کو نصیحت کرتے تھے کہ کبھی نئی شاعری کے قریب مت پھٹکنا اور ہمیشہ کسی کا مصرع سامنے رکھ کر شعر کہنا۔ کتنے ہی جوہر قابل ان کی ان حرکات سے وقت سے پہلے دم توڑ گئے ہوں گے۔ گروپ بندیاں بھی عروج پر تھیں۔ میں لانڈھی آنے کے بعد اکیلا ہو گیا تھا۔ کسی استاد کا شاگرد بھی نہیں تھا کہ اس کے جھنڈے تلے آ جاتا۔ اس لیے میں تب بھی کورنگی کے مشاعروں میں جاتا تھا۔ لانڈھی کے مشاعرے بہت کم پڑھتا تھا۔ کم پڑھتا تھا لیکن نہ پڑھنے کی قسم بھی نہیں کھائی تھی۔

غلام غوث ایک شاعر تھا۔ اسکول ماسٹر تھا' لڑکیوں کے اعتبار سے پڑھا لکھا بھی بہت تھا لیکن شاعروں اور مشاعروں کی فی سبیل اللہ خدمت کے باوجود ہمیشہ پہلے دوسرے نمبر پر اسے پڑھوایا جاتا تھا۔ لانڈھی میں وہ اور کورنگی میں فیض امروہوی ایک ہی قبیل کے شاعران کرام تھے۔ دونوں کی جیبیں مشاعروں کے دعوت ناموں سے بھری ہوتی تھیں۔ ہمیشہ ابتدا میں پڑھ لیتے تھے' اس لیے ایک رات میں کئی کئی مشاعرے بھگتا دیتے تھے۔ خوش فہمی کا یہ عالم تھا کہ جو مشاعرہ بھی ہوتا تھا' وہ فرض کر لیتے تھے کہ انہیں بلایا ضرور گیا ہے۔

ایک مرتبہ ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے کا پوسٹر بھی شائع ہوا تھا جس میں شعرائے کرام کے اسمائے گرامی شائع ہوئے تھے۔

فیض امروہوی ان پوسٹروں کو تقسیم کرتے پھر رہے تھے جب کہ خود ان کا نام اس پوسٹر میں نہیں تھا۔ یار لوگوں نے توجہ دلائی۔

"فیض صاحب' آپ کا اس پوسٹر میں نام نہیں ہے۔"

"پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میرا نام

ہے۔"

سب نے پوسٹر کو ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ ان کا نام ہوتا تو نظر آتا۔

"فیض صاحب' کہاں ہے آپ کا نام؟"

"لائیے اِدھر۔" انہوں نے پوسٹر اپنے سامنے رکھ لیا "یہ دیکھیے' یہ لکھا ہوا ہے "اور دیگر شعرا" میرا نام ان دیگر شعرا میں ہے۔ انتظامیہ کمیٹی نے مجھے بتا دیا ہے۔"

اس عجیب و غریب دلیل پر ہنسنے کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔

غلام غوث سائیکل پر دعوت نامے بانٹنے نکلے تھے۔ میرے پاس بھی آئے۔ طرحی مشاعرہ تھا۔ بدنام کیا ہوگا' انجام کیا ہوگا کی زمین تھی۔

"مستان جون پوری نے خاص طور پر آپ کو کہلوایا ہے۔ لانڈھی والوں کی عزت کا سوال ہے۔"

"عزت' بے عزتی کا سوال کہاں سے آگیا۔" میں نے پوچھا۔

"کورنگی کے شاعر بڑی تیاری سے آرہے ہیں۔ آپ لانڈھی والوں کی طرف سے ہوں گے۔"

"ابے مشاعرہ کر رہے ہو یا پتنگوں کے پیچ لڑا رہے ہو۔"

"آپ کہیں گے تو اگلے ہفتے وہ بھی رکھ لیں گے۔ ابھی تو مشاعرہ ہے۔ کورنگی والوں کو ہرانا ہے۔"

میں نے وعدہ کر لیا۔ اس وقت تک میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کے جاتے ہی مطلع ہو گیا' غور کیا تو شعر بھی ہو گئے۔ میں نے سوچا غزل مکمل کر کے پہنچ جاؤں تو کوئی حرج بھی نہیں۔ میں نے غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچ گیا۔ شاعروں کی فوج ظفر موج تھی جو حملہ آوروں کی طرح پورے صحن میں پھیل گئی تھی۔ بہ قول شخصے تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں نے فہرست دیکھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے' پچھتر شاعروں کے نام درج تھے۔ مزید برآں ایک خبر یہ بھی پہنچ چکی تھی کہ ایک جگہ مشاعرہ ہو رہا ہے۔ وہاں سے فارغ ہونے والے شعرا بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ صاحب مشاعرہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ بڑا کامیاب مشاعرہ ہونے والا ہے۔

میری توقع کے برخلاف جمال احسانی بھی وہاں موجود تھا۔ میں شعرا کو پھلانگتا ہوا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ یوں سہما ہوا بیٹھا تھا جیسے مقتل میں آگیا ہو۔

"یار' یہ مشاعرہ کیا ایک مہینے تک چلے گا۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ایک مہینے تک نہیں تو کل دوپہر تک ضرور چلے گا۔ مجھے ان مشاعروں کا بہت تجربہ ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر میں چلا۔" اس نے کہا "بلکہ تم بھی کھسک لو۔ رات ہی کالی کرنی ہے تو کہیں اکیلے بیٹھ کر کرلیں گے۔"

"بیٹھے رہو۔ اس کا توڑ بھی ہے میرے پاس۔ پڑھتے ہی باہر نکل جانا۔ میں بھی آجاؤں گا۔"

اس سے بات کرنے کے بعد میں مستان جون پوری کے پاس پہنچا جس کے پاس فہرست تھی۔

"مجھے اور جمال احسانی کو ساتھ ساتھ پڑھوانا۔"

"کیوں.... کیوں بھئی۔"

"کورنگی والوں کو اس پر بڑا ناز ہے۔ اس کے فوراً بعد پڑھوں گا تو اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔" میں نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک شاعر قتل ہو رہا تھا۔ ایک سے ایک قافیہ بندھ رہا تھا اور کھل رہا تھا۔ ہم باتیں بھی کہاں تک کرتے۔ خدا خدا کر کے جمال کا نام پکارا گیا۔ وہ جھومتا جھامتا اٹھا اور غزل شروع کر دی۔

حضورِ صبح بتلاؤ خراجِ شام کیا ہوگا
ہماری تیرہ بختی کا بھلا انجام کیا ہوگا
وہ ہر انداز سے بالکل خداؤں جیسا لگتا ہے
تو پھر یہ سوچنا کیسا کہ اس کا نام کیا ہوگا
مرے دل میں تمہاری خامشی کی گونج رقصاں ہے
اسے سنّاٹا کہتے ہو تو پھر کہرام کیا ہوگا
خریداروں میں کب کوئی زلیخائے محبت ہے
مرادل صورتِ یوسف بھلا نیلام کیا ہوگا
مناؤں گا اسے میں سعیِ لاحاصل ہے یہ میری
وگرنہ جانتا ہوں میں وہ مجھ سے رام کیا ہوگا
وفا کی خواہشیں ہیں تم کو اس سے تم بھی پاگل ہو
جمالؔ اس برہمن کے جسم پر احرام کیا ہوگا

وہ اتنے پُراعتماد لہجے میں پڑھتا تھا کہ داد نہ ملتی ہو تو ملنے لگے۔ بے پناہ تعریفوں کی سندوں میں اس نے غزل ختم کی اور میرے کہنے کے مطابق باہر نکل گیا۔ طے ہو چکا تھا کہ لہٰذا اس کے فوراً بعد میرے نام کی صدا پڑ گئی۔ میں نے بھی غزل ختم کی اور باہر آگیا۔ وہ گلی میں ٹہل رہا تھا۔ ہم دونوں باقاعدہ بھاگتے ہوئے گلی سے نکلے اور سڑک پر آگئے۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔

میرا گھر لانڈھی ہی میں تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اپنے گھر تک کیسے پہنچے۔ اس وقت کوئی سواری ملے' یہ اتنا آسان نہیں تھا پھر میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ جاؤں اور اسے گھر تک چھوڑ کر واپس آجاؤں۔ یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ راستے میں ملنے والے اکا دکا پولیس والے بھی مجھے جان گئے تھے۔ میری وجہ سے اس کی بھی ہمت ہو گئی اور ہم پیدل روانہ ہو گئے۔

میں نے پہلی مرتبہ اس کا گھر دیکھا۔ کورنگی کے تمام مکانات چونکہ حکومت نے بنا کر دیے تھے اس لیے یکساں طرز کے تھے لیکن بعد میں لوگوں نے اپنی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں کرلی تھیں۔ اس کے گھر میں بھی دروازے سے آدھے صحن تک ایک فاضل کمرا بنا ہوا تھا۔ کمرے کے آگے سائبان تھا۔ غسل خانہ' باورچی خانہ وغیرہ

اسی پرانی حالت میں تھے۔ فرنیچر برائے نام تھا۔ گھر کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ بہنوں کی شادی ہو جانے کی وجہ سے سارا انتظام لڑکوں کے ہاتھ میں ہے۔ بوڑھی ماں ہے' ان سے جتنا ہو سکتا ہوگا وہ کر لیتی ہوں گی۔

اس کی والدہ اس وقت گھر پر نہیں تھیں' دونوں بھائی بے سدھ سو رہے تھے۔

"اماں گئی ہوئی ہیں ورنہ آج تمہاری ان سے ملاقات ہو جاتی۔" اس نے کہا۔

"اب تو گھر دیکھ ہی لیا ہے پھر آؤں گا تو ضرور ملوں گا۔" میں نے کہا۔

میں اس ارادے سے آیا تھا کہ اسے چھوڑ کر واپس آجاؤں گا لیکن اس نے ضد کر کے مجھے روک لیا۔ کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے پھر زمین پر پڑی فرشی دری پر سو گئے۔

دوسرے دن ہم سو کر اٹھے تو دن چڑھ آیا تھا۔ اس کا گھر مردانہ ہوسٹل کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

میں کھانے کا شوقین نہیں ہوں لیکن ناشتے کا بہت کچا ہوں۔ صبح سو کر اٹھنے کے بعد مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ یہاں سب پڑے سو رہے تھے۔ کوئی ناشتا بنانے والا بھی نہیں تھا۔ میں اسے لے کر باہر آگیا تاکہ ہوٹل سے ناشتا کیا جائے۔ ہوٹل کے قریب پہنچ کر اس نے کچھ سوچا۔

"آؤ' ایک اور جگہ چل کر ناشتا کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

میں سمجھا وہ مجھے کسی اور ہوٹل پر لے جا رہا ہے۔ وہ تین گلیاں عبور کر کے' اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔

"اللہ! جمال بھائی۔" ایک نسوانی آواز آئی اور وہ اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر' خود دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں اکیلا بیٹھا تھا اور دوسرے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا اس گھر میں ایک سے زیادہ لڑکیاں ہیں اور جمال یہاں بہت مقبول ہے۔ ہر طرف جمال بھائی اور جمال کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے فقرے میری سماعت تک آ رہے تھے۔ میں شروع میں یہ سمجھا تھا کہ یہ اس کے کسی رشتے دار کا گھر ہوگا لیکن کچھ دیر بعد مجھے اپنے اندازے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکا اتنا سیدھا نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اس کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی۔ مسلسل بول رہا تھا اور ایسا بول رہا تھا کہ کئی مرتبہ میں بھی ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ میں اکیلا بیٹھا ہوں اور دلچسپی بھی لے رہا تھا۔

"آیار' ناشتا کر لے۔" وہ ناشتا لے کر کمرے میں آیا۔

"کس کا گھر ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"اماں گھر پر نہیں ہوتیں تو میں تینوں وقت کا کھانا یہیں کھاتا ہوں۔"

"وہ تو کھاتے ہو مگر یہ ہیں کون۔ تمہارے رشتے دار ہیں؟"

"ہماری دوست کا گھر ہے یار۔"

"اس گھر میں تو کئی دوستیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کئی لڑکیاں نظر آ رہی ہیں۔"

"ہاں' بے تکلفی تو سب ہی سے ہے۔ ناشتا کر یار۔"

اچھا خاصا پُرتکلف ناشتا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔ ناشتے کے بعد وہ پھر اندر چلا گیا لیکن اس مرتبہ جلد ہی آگیا۔

"چائے ایک دوست کے گھر پئیں گے۔" اس نے کہا اور میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔

اسی گلی کے پیچھے' وہ مجھے ایک اور گھر میں لے گیا۔ وہاں بیٹھ کر چائے پی۔

یہاں صرف ایک خاتون تھیں جنہوں نے پردہ نہیں کیا۔ چائے میں بھی شریک رہیں اور باتوں میں بھی۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جمال کو بہت بڑا شاعر سمجھتی ہیں۔ دو گھروں میں اس کی مقبولیت دیکھ کر خود مجھے محسوس ہونے لگا کہ جمال جب گھر سے چلا تھا تو اتنا بڑا نہیں تھا' اچانک بڑا ہو گیا ہے۔ وہ کتنا بڑا ہو گیا تھا' یہ مجھے اس وقت پتا چلا جب میں واپس اس کے گھر آیا۔

میری غزلیں اس وقت کے ایک رسالے "جامِ نو" میں شائع ہوئی تھیں۔ وہ ان غزلوں کو اس پرچے میں پڑھ چکا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے پوچھا۔

"یار' ان رسالوں میں غزلیں چھپتی کس طرح ہیں؟"

"کس طرح کیا' غزل لکھ کر بھیج دو۔ ایک خط ایڈیٹر کے نام لکھ دو۔"

"تمہاری غزلیں تو چھپتی رہتی ہیں۔"

"ہاں' کئی غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔"

وہ محلے جہاں اس نے قیام کیا

کورنگی سوکوارٹرز۔ فیڈرل کیپٹل ایریا۔ ناگن چورنگی' نارتھ کراچی۔ دستگیر کالونی۔ گلشنِ اقبال (ابوالاصفہانی روڈ) گلشنِ اقبال (نیپا چورنگی) کلفٹن۔ گلستانِ جوہر۔

○☆○

قطعہ تاریخِ وفات

رُخصت ہوئے دنیا سے جمال احسانی
لاحق تھا جگر کا مرضِ طولانی
ہیں سایۂ رحمت میں بہ آغوشِ لحد
ذیشان جگر ریش جمال احسانی

(راغب مراد آبادی)

"تمہیں ایڈیٹر جانتا بھی ہوگا؟"

"کبھی ملاقات تو نہیں ہوئی' بس خط لکھ دیتا ہوں۔"

"اچھا' ایسا کرو۔ میں ایک کاغذ پر غزل اتارے دیتا ہوں' خط تم لکھ دو۔ میرا تعارف ذرا اچھی طرح کرا دینا۔"

اس نے غزل اتاری' میں نے وہیں بیٹھ کر خط لکھا۔ لفافہ گھر میں تھا۔ جام نو کا پتا لکھا اور بعد میں پوسٹ کر دیا۔ پرچہ آیا تو اس کی غزل بھی تھی۔

دن بھر اس کے گھر رہنے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اس کے دوست بے انتہا ہیں لیکن شاعروں میں ابھی اس کی زیادہ لوگوں سے شناسائی نہیں ہے۔ زیادہ تر وہ دوست ہیں جن کے ساتھ وہ کرکٹ کھیلتا ہے یا تاش کے پتے پھینکتا ہے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا اور بڑے اچھے جواریوں سے معلوم ہوا کہ وہ فلیش اور رمی کھیلنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔

اس کے بدن میں کچھ ایسی مقناطیسی لہریں تھیں کہ صنفِ مخالف اس سے ملتے ہی صنفِ موافق بن جاتی تھی۔ وہ مجھے دن بھر میں جتنے گھروں میں لے کر گیا' مجھے ایسا لگا جیسے وہ پریوں کے دیس کا شہزادہ ہے' اپنے خواب محل سے نکل کر کچھ دیر کے لئے پائیں باغ میں آگیا ہے جہاں بنا پروں والی پریاں پلکوں کا فرش بچھائے' آنکھوں کے کنول سجائے اس کی منتظر ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ داستان گو بن جاتا تھا۔ سب دم سادھے اس کی باتیں سنا کرتی تھیں۔ جادوگر کا جادو' لڑکیوں کو کٹھ پتلیاں بنا دیتا تھا پھر ڈور اس کی' اشارہ اس کا' کشتی اس کی کنارہ اس کا۔ گھر سے نکلتے ہی اسے وہ فضا میسر آگئی جسے اس نے اپنی شاعری میں عشق کا نام دیا۔ اس کارِ خیر میں دیر سویر کے عادی لوگوں کا وہ قائل ہی نہیں تھا۔

ہیں خوب لوگ جنہیں عشق کا مرض لاحق
ہزار طرح کی بیماریوں کے بعد ہوا

کیا پہلے اور کیا بعد' اس نے تو عشق کے سوا کسی اور بیماری کو کبھی خریدا ہی نہیں۔ اس نے تو دوستوں سے بھی دوستی نہیں کی' عشق کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بہتے ہوئے پانی کی طرح تھا۔ دوسرا عشق کرتے ہوئے پہلے عشق کی طرف کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ ایسا عاشق تھا جو قدم بہاتے ہی معشوق بن جاتا تھا اور پھر ناز اٹھواتا تھا۔ اب یہ اس کے معشوق پر منحصر تھا کہ وہ کتنی دیر اس کے ساتھ چل سکتا ہے۔ وہ چلتا نہیں تھا دوڑتا تھا۔ اس لیے ساتھ دینے والے اکثر پیچھے رہ جاتے تھے لیکن اس بے پروا کو کیا پروا۔ اس کے لیے ٹھکانے بہت تھے' آشیانے بہت۔

مجھ سے بھی اس نے اسی وقت تک عشق کیا جب تک میں اس کے گھر چلا نہیں گیا۔ اس کے بعد میں اس کے عشق میں ایسا گرفتار ہوا کہ رفتہ رفتہ اسے معشوق بنا دیا۔ شام ہوئی اور اس کی گلی میں جا پہنچا۔ کبھی وہ مل جاتا' کبھی میں لوٹ آتا۔ کبھی وہ مجھے گھر بٹھا کر چلا جاتا کہ ابھی آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس واردات پر نکلا ہوا ہے لیکن میں اس کی واپسی تک اس کا انتظار کرتا۔ چھٹی کے دن وہ کرکٹ میچ کھیلتا اور میں گراؤنڈ میں باہر بیٹھ کر میچ دیکھتا۔

ہر وقت کے ساتھ نے مجھے اس کے گھر کا فرد بنا دیا تھا۔ اس میں تمام تر حصہ خود جمال کا تھا۔ وہ جب کسی کی عزت کرتا تھا تو اپنے متعلقین کو بھی مجبور کر دیتا تھا کہ وہ بھی عزت کریں۔ اس شخصیت کو اتنی اہمیت دیتا تھا کہ دوسروں کی نظروں میں بھی اسے اہم بنا دیتا تھا۔ ایسی ایسی خوبیاں' تلاش کر کر کے بیان کرتا تھا کہ ذات کو والا صفات کر دیتا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں میرا تذکرہ اتنی بار کیا اور اس محبت سے کیا کہ اس کی ماں' بلال' جمال' ہلال اور مصطفےٰ کی طرح مجھے بھی اپنا بیٹا ہی کہنے اور سمجھنے لگیں۔ وہ بڑی سیدھی سادی اور محبت بھری ماں تھیں۔ جمال پر تو جان چھڑکتی تھیں۔ غیر جس کے عاشق ہوں' ماں اس کی عاشق کیوں نہ ہوتی۔ وہ انہیں اماں کہتا تھا اور وہ اسے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتی تھیں "ٹ" کے اوپر جب وہ تشدید لگاتی تھیں تو کانوں میں رس گھلنے لگتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ جمال کو لڑکی بنا کر اپنے آنچل سے چھپا کر بیٹھی رہتیں اور جمال کا یہ حال کہ لڑکا بھی ڈھنگ کا نہ بن سکا تھا۔ ان کے اور بھی تو بیٹے تھے لیکن یہ تو عجیب سا تھا۔ نہ گھر میں آنے کی خبر نہ جانے کا پتا۔ گھر کے کاموں سے شغف نہ سودے سلف کے مطلب کا۔ وہ شاعری واعری تو جانتی نہیں تھیں' بس انہیں یہ فکر رہتی تھی کہ ان کا جمال دوست بازی میں پڑ کر کہیں خراب نہ ہو جائے۔ میں کبھی جمال کی غیر موجودگی میں پہنچ جاتا تو وہ ایک ہی بات پوچھتیں۔

"اے بیٹا' سچ سچ بتا جمال جاوے کہاں ہے؟ رات رات بھر گھر نہیں آتا۔ میں اس کا خالی بستر تکتی رہتی ہوں۔"

"اماں' آپ کو معلوم نہیں جمال کتنا بڑا شاعر ہے۔ رات رات بھر اس کے قدردان اس سے غزلیں سنتے رہتے ہیں۔" میں کہتا۔

"اے ہے' تھک جاتا ہوگا میرا بچہ تو۔"

"ہاں تھک تو جاتا ہے مگر مشہور بھی تو بہت ہو گیا ہے۔"

"خاک میں ملے ایسی مشہوری۔ جاگ جاگ کر پیلا پڑ گیا ہے میرا بچہ۔ مصطفےٰ اور ہلال کی طرح دو گھڑی چین سے سوتا ہی نہیں ہے۔"

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس کے بغیر کتنے گھروں میں رت جگا ہوتا ہے۔ کہاں کہاں اس کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسے یاد کر کے جاگتے ہیں' کچھ وہ ہیں جو اس کے قرب میں جاگتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ جاگنے والوں کو ساتھ لے کر گھر پہنچتا تھا تب ان جاگنے والوں کو نیند آتی تھی۔ اس کی ماں اس وقت بھی اس کا خالی بستر تکتی رہتی ہوں گی کیونکہ وہ تو دوستوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں سو جاتا تھا۔

مائیں تو مامتا کی تصویر ہوتی ہی ہیں لیکن اس کی ماں تو ایسی تھی کہ بس مثالوں اور کہانیوں میں ہی ملتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا

کہ جمال یا تو بگڑ چکا ہے یا اتنی محبت کے بعد بگڑ جائے گا۔ وہ سو کر اٹھتا نہیں تھا کہ چائے بنا کر لے آتی تھیں کیونکہ جمال نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ بیڈ ٹی پیا کرے گا۔ بیڈ ٹی کی تعریف اس کی ماں اس طرح کیا کرتی تھیں کہ بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں چلائے بغیر چائے پینے کو بیڈ ٹی کہتے ہیں۔ وہ رات کو کسی وقت بھی گھر پہنچے' اس کے لیے اسی وقت گرم گرم روٹیاں پکاتی تھیں۔ اتنی محبتوں کے بعد کون ہوش میں رہتا ہے۔ اگر جمال بہت دن ہوش میں رہ لیا تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ محبت کی یہ بارش تھم تھم کر برسی۔ اماں محبتوں کی سوغات بانٹنے کبھی ایک بیٹی کے' کبھی دوسری بیٹی کے' کبھی تیسری بیٹی کے' کبھی بہو کے پاس جاتی رہتی تھیں۔ اس کا گھر اکثر مردانہ ہی رہتا تھا۔ چھوٹے بھائی ایسے سعادت مند کہ کوئی سگریٹ لانے بھاگا جا رہا ہے کوئی ہوٹل والے سے چائے کا کہہ کر آ رہا ہے۔

محبتوں کے معاملے میں اس کی خوش قسمتی قابلِ رشک تھی۔

اس کی بہنیں اس سے روایتی محبت کرتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ آنکھوں کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتیں۔ آمنا سامنا ہو جائے تو اس طرح واری صدقے ہوتیں جیسے وہ پردیس سے آیا ہے اور پردیس کو سدھار جائے گا۔

اتنی محبتوں کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں رہ گیا تھا۔ وہ مکمل ہو گیا تھا۔ اکثر شعرا کسی نہ کسی محرومی سے دوچار ہو کر اپنی حساسیت کی بدولت نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جمال کی شخصیت میں کوئی کجی نہیں تھی۔ ان محبتوں نے اسے خود اعتمادی عطا کی تھی' مروانگی بخشی تھی' تن کر چلنا سکھایا تھا۔

○☆○

میرا سفر تو اس تک پہنچ کر ختم ہو گیا تھا۔ میں نے تو منزل پا لی تھی لیکن وہ رکنے والا نہیں تھا۔ وہ بند دیواروں میں روزن بناتا رہا۔ ہر مشاعرے میں ایک دوست بنا لیتا اور میرے حوالے کر دیتا۔

"یاد صدیقی کو جانتے ہو؟"

"ہاں' ایک مشاعرے میں سنا تو ہے۔"

"سننے کے باوجود دوستی نہیں ہوئی؟"

"بس نہیں ہوئی۔"

"جدید شاعر ہے یار۔ پتھر' پیڑ' دروازہ' کیسے کیسے لفظ استعمال کرتا ہے۔ ہم سالے اسی گھل دبلیل میں پڑے ہوئے ہیں تم تو بالکل میر تقی میر بن گئے ہو۔"

اسے جو چیز پسند آ جاتی تھی' اسے نوچنے کھسوٹنے کی دہشت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اسی وقت مجھے لے کر لانڈھی کے ایک ہوٹل پر پہنچ گیا۔

"یہ اجنبی ہوٹل ہے۔"

"ابے مجھے کیا بتا رہا ہے' میں تو رہتا ہی یہیں ہوں۔"

"کیا خاک رہتے ہو۔ یاد صدیقی تک سے تو ملے نہیں ہو۔ کبھی بیٹھے ہو اس ہوٹل میں۔"

غزل

تیری یاد اور تیرے دھیان میں گزری ہے
ساری زندگی ایک مکان میں گزری ہے
اس تاریک فضا میں میری ساری عمر
دیا جلانے کے امکان میں گزری ہے
اپنے لیے جو شام بچا کر رکھی تھی
وہ تجھ سے عہدوپیمان میں گزری ہے
تجھ سے اکتا جانے کی خواہش بھی
تیرے عشق ہی کے دوران میں گزری ہے
دیواروں کا شوق جہاں تھا سب کو جمال
عمر مری اس خاندان میں گزری ہے

○☆○

"بھائی' یاد صدیقی چیز کیا ہے۔ اب ملوا ہی دو۔"

"تم یہاں بیٹھو' میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔"

وہ تو ایک گلی میں گھس گیا اور میں یہ سوچنے لگا کہ بیٹھوں کہاں۔ اِدھر اُدھر میزیں اور کرسیاں بکھری پڑی تھیں۔ عجیب عجیب سے لوگ خوش گپیوں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ جس کا جہاں جی چاہتا' کرسی گھسیٹ کر لے جاتا۔ ہوٹل کہیں رہ گیا تھا' ہوٹل میں بیٹھنے والے کہیں پہنچ گئے تھے۔

میں ایک طرف کھڑا ہو کر جمال کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک لمبے سے لڑکے کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے ہاتھ پیروں کی ساخت سے شاعر تو نہیں البتہ باڈی بلڈر یا باکسر لگ رہا تھا۔

اس کے آتے ہی ہم نے بھی کرسیاں اٹھائیں اور ایک درخت کے نیچے ڈال کر بیٹھ گئے۔

میں نے دیکھا کہ یاد صدیقی کو یہاں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہر ہاتھ اسے سلام کرنے کے لیے اٹھ رہا ہے' جو ادھر سے گزر رہا تھا' اس سے ہاتھ ملانے کے لیے رکنا ضرور تھا۔

"کیا حال ہے ماسٹر صاحب؟"

"اور سناؤ معبود۔"

"صدیقی صاحب خیریت ہے؟"

جو اسے جس نام سے جانتا تھا' پکار رہا تھا۔ ماسٹر اس لیے تھا کہ ایک کوچنگ سینٹر میں پڑھا رہا تھا۔ معبود اس کا نام تھا اور صدیقی اس کی ذات تھی۔ یاد تخلص تھا اس لیے ہم شاعروں کے لیے تو وہ یاد تھا۔

وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے ہم دونوں کا سرپرست ہو۔ کون سے مشاعروں میں جانا چاہیے' کہاں نہیں۔ کس قسم کی شاعری کرنی چاہیے۔ اساتذہ کے کلام کو پڑھا کرو۔ تجربہ جب تک بلند ہو کر احساس کی سطح تک نہیں آ جاتا' اچھا شعر نہیں ہوتا۔ وہ اتنی سنجیدگی سے نصیحت کر رہا تھا جیسے یہ سب باتیں ہم آج پہلی بار سن رہے ہیں۔

میں تو خیر صرف سن رہا تھا لیکن جمال سنجیدگی سے غور بھی کر رہا تھا۔ موضوع گفتگو جمال کی شاعری کی طرف ہوا تو اس نے ایسی ایسی معنوی خوبیاں اور نئی باتیں نکال لیں کہ میں حیران تھا۔ اس میں تنقیدی حس بہت تھی۔ گفتگو بہت ٹھہر ٹھہر کر، نپے تلے انداز میں کر رہا تھا۔

اجمیری ہوٹل بھی خوب تھا۔ شاعروں سے لے کر بدمعاشوں تک، سحر خیزوں سے لے کر شب بیداروں تک، سب اسی دروازے کے مجاور بنے بیٹھے رہتے تھے۔ ہر طبقہ فکر کا آدمی یہاں مل جاتا تھا اور ہر وقت مل جاتا تھا۔ ہوٹل کیا تھا، نشہ تھا جو صبح آکر بیٹھ جاتا، رات کی خبر لیتا تھا۔ ہوٹل کا مالک بھی عجیب بے زبان تھا۔ نہ آنے والے کی خوشی نہ جانے والے کا افسوس۔ کس نے کتنی چائے پی، پیسے دیے، نہیں دیے۔ کسی بات سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

یہاں بیٹھنے والوں کی ڈاک تک اسی ہوٹل کے پتے پر آتی تھی۔ بیویاں اپنے شوہروں کو بلانے آتی تھیں کہ کھانا پک گیا، چل کر کھالو۔ وقت گزارنے والے بچپنی اور لوڈو تک اپنے ساتھ لاتے تھے۔ ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ہر قسم کا مال ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔ جمال نے یہاں بیٹھنا شروع کیا تو شاعروں کی آمدورفت بڑھنے لگی۔ اسمٰعیل انیس اپنے شاگردوں کی غزلوں پر یہیں بیٹھ کر اصلاح دینے لگے۔ غبار رام پوری کچھ فاصلے پر بیٹھ کر انہیں گھورتے رہتے تھے۔ انہیں یہ شکوہ تھا کہ اسمٰعیل انیس نے ان کے بہت سے شاگرد توڑ لیے تھے۔ ممتاز قیصر (جو بعد میں ممبر صوبائی اسمبلی ہوا) روز یہ اعلان کرتا تھا کہ اب وہ شاعری شروع کردے گا لیکن شروع نہیں کر سکا البتہ اچھا سامع بن گیا۔ محسن اسرار بڑے خلوص سے تمباکو والے پان تقسیم کرتا رہتا تھا۔ جمال نے اپنی کئی غزلیں اسی ہوٹل میں بیٹھ کر مکمل کیں۔ کبھی وہ کوئی مطلع گھر سے لے کر آتا اور غزل یہاں کہتا۔ کبھی محسن اسرار اسے چڑھا دیتا کہ اس زمین میں غزل کہہ کر دکھاؤ اور وہ مصروف سخن ہو جاتا۔

جمال پیدل چلنے کا چور تھا۔ بس میں بھی بہ حالت مجبوری سفر کرتا تھا۔ رکشا، ٹیکسی سے کم بات ہی نہیں کرتا تھا۔ رکشا والے کو گلیوں گلیوں لیے گھومتا تھا۔ رکشا والے بھی اس سے واقف ہو گئے تھے کہ وہ جہاں کہتا چلنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ایک رکشا والا تو اس پر ایسا فدا ہوا کہ مفت ہوا کھلاتا پھرتا تھا۔ اس کو بھی اس کے دوستوں کو بھی۔ لطف تو اس وقت آیا جب جمال اسے بھی اپنی لائن پر لے آیا یعنی وہ رکشا والا بھی آزاد تخلص اختیار کر کے شعر کہنے لگا۔

وہ آزاد کے رکشا پر اڑتا پھر رہا تھا۔ ایک دن ہوٹل کے سامنے رکشا آکر رکا۔ جمال بڑی شان سے رکشا سے اترا۔ ہاتھ میں ڈن ہل کا پیکٹ لیے خراماں خراماں ہماری طرف آیا۔ رکشا والا بھی اس کے ساتھ تھا۔

"استاد، میں بھی یہاں بیٹھ جاؤں؟" رکشا والے نے پوچھا۔

ہم سب حیران تھے کہ وہ استاد کس کو کہہ رہا ہے۔ میں سمجھا یاد سے مخاطب ہے لیکن جب جمال نے اسے بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تو حقیقت کھلی پھر جمال نے ایک ایک کر کے سب سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ تیس سال سے بڑی عمر کا آدمی تھا۔ جمال کو استاد استاد کہتا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا۔

"استاد، اب سناؤں غزل؟" اس نے جمال سے پوچھا۔

"سناؤ مگر زاجم کے سنانا۔ ایک سے ایک حرامی شاعر بیٹھا ہوا ہے تمہارے سامنے۔"

"استاد تم فکر ہی مت کرو۔ میں بھی کوئی کم حرامی نہیں ہوں۔"

اس نے گلا صاف کیا اور ایسی بلند آواز میں ترنم چھیڑا کہ اگر بروقت اسے روک نہیں دیا جاتا تو اچھا خاصا مجمع لگ جاتا۔

"آزاد صاحب، یہ جگہ ترنم کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس وقت تو ویسے ہی کچھ سنا دیجیے۔" یاد صدیقی نے اس سے کہا۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔ یہ ترنم مجھے بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ استاد نے بنا کر دیا تھا اس لیے قبول کرنا پڑا۔"

اس نے غزل سنانا شروع کی۔ ہر شعر کے بعد استاد (جمال) سے پوچھ لیتا تھا میں نے ٹھیک پڑھا؟ پھر اگلا شعر پڑھتا تھا۔

غزل ختم ہونے کے بعد اس نے اپنی طرف سے ہم سب کو چائے پلائی اور سب کے ہاتھ چومے کیونکہ بقول اس کے ہم سب اس کے استاد بھائی تھے۔

"استاد، میں ذرا سواریاں اِدھر اُدھر کر آؤں۔ ایک گھنٹے بعد آکر آپ کو لے جاؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد جمال نے ہمیں بتایا کہ موصوف نے جو غزل پڑھی تھی وہ جمال نے لکھ کر دی تھی۔

ایک گھنٹے بعد وہ آگیا۔ اب استاد کو جانا تھا۔ مفت کی سواری ملی تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔

"آؤ، تمہیں ایک جگہ لے کر چلتا ہوں۔" میں نے جمال سے کہا۔

"کہاں؟"

"ڈاکٹر یوسف جاوید کے کلینک۔"

"کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں یار، رات کو وہاں شاعروں کی پھڑ جمتی ہے۔ اس وقت سب جمع ہوں گے، تفریح رہے گی۔"

یوسف جاوید کے کلینک پر ایک لڑکا نور احمد میرٹھی کام کرتا تھا۔ شاعر نہیں تھا لیکن بے حد ادب نواز تھا۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اس نے ایک بزم "اتحاد ادب" کے نام سے بنائی تھی۔ اس بزم کے زیر اہتمام ہر ہفتے پندرہ دن بعد کسی نہ کسی کے گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ یوسف جاوید چونکہ شاعر تھے اس لیے چار چھ شاعر ہر وقت کلینک پر جمع رہتے تھے۔ میں تو تقریباً روزانہ ہی یہاں آتا تھا، آج سوچا جمال کو بھی سب سے ملوا دوں۔

کلینک کے آگے کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہمارے رکشا نے شور مچایا تو جھکی ہوئی گردنوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ انجم فوقی اور شکیل احمد

ضیا' دو اساتذہ ایک جگہ جمع تھے لہٰذا خاموش تو ہونا ہی تھا۔ دونوں استاد چپ بیٹھے تھے۔ یوسف جاوید منہ میں دبے پان کی وجہ سے چپ تھے۔ نور احمد تو بولتا ہی بہت کم تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی ٹھہرے ہوئے پانی میں حرکت آگئی۔

"یہ جمال احسانی ہیں۔ بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔" میں نے تعارف کرایا۔

شکیل احمد تو شاید اسے جانتے تھے لیکن انجم فوقی بدایونی اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ دیکھ کیا رہے تھے' جمال کے تیکھے نقوش میں الجھ کر رہ گئے۔ ہاتھ ملانے کے بہانے ہاتھ جو پکڑا تو ہاتھ چھوڑنا ہی بھول گئے۔

"مولانا' آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" نور احمد نے صورت حال بھانپتے ہوئے کہا۔

انہوں نے ہاتھ چھوڑ دیا مگر اتنا کرم پھر بھی کیا کہ اسے اپنے برابر والی کرسی پیش کی۔

"میاں' اتنے دن سے دھوم مچا رہے ہو' مشاعرے لوٹ رہے ہو' کبھی غریب خانے کو رونق نہیں بخشی۔" انجم فوقی نے کہا۔

"جی' وہ' آپ سے تعارف جو نہیں تھا۔"

"اب تو ہو گیا تعارف۔" انہوں نے جمال کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "کسی دن آجاؤ' مجھے خوشی ہوگی۔"

"کسی دن ضرور حاضری دوں گا۔" جمال نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

وہ اندر سے اتنا شرمیلا بھی ہے' اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وہ ان کے برابر بیٹھا ضرور تھا لیکن بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

"جمال میاں' اپنے نام کی طرح خوب صورت ہیں اور ان کی غزلیں ان سے بھی زیادہ خوب صورت۔" فوقی صاحب نے پھلجھڑی چھوڑی۔

"واہ حضرت' کیا بات پیدا کی ہے۔" ڈاکٹر جاوید نے شعر کی طرح جملے کی تعریف کی۔

"جمال بھائی' کچھ تازہ شعر ہوں تو اس وقت ہو جائیں۔" نور احمد نے فرمائش کی۔

جب میں نے بھی کہا تو جمال نے نیم رضامندی کے ساتھ غزل شروع کی۔

کیا قیامت ہے کہ ایسے بھی مراحل آئے
سائے انسان کی عظمت کے مقابل آئے

ابھی اس نے مطلع ختم ہی کیا تھا۔ انجم فوقی کی بے پناہ داد کا شور ابھی تھما نہیں تھا کہ آزاد رکشا والا جو ابھی تک رکشا میں بیٹھا تھا' رکشا سے کود کر آگیا۔

"استاد' یہ تو کوئی شرافت نہیں ہے۔ تم نے کہا تھا استاد کہ کلام کو غور سے سنا کرو۔ کیا خاک غور سے سنوں۔ تم اکیلے اکیلے شعر سنانے لگے۔"

یہ تازہ بلا اتنی اچانک نمودار ہوئی کہ سب دم بخود رہ گئے۔ میں

غزل

ایک فقیر چلا جاتا ہے پکی سڑک پر گاؤں کی
آگے راہ کا سناٹا ہے پیچھے گونج کھڑاؤں کی
آنکھوں آنکھوں ہریالی کے خواب دکھائی دینے لگے
ہم ایسے کئی جاگنے والے خیمہ ہوئے صحراؤں کی
اپنے عکس کو چھونے کی خواہش میں پرندہ ڈوب گیا
پھر بھی لوٹ کر آئی نہیں دریا پر گھڑی دعاؤں کی
ڈار سے بچھڑا ہوا کبوتر شاخ سے ٹوٹا ہوا گلاب
آدھا دھوپ کا سرمایہ ہے آدھی دولت چھاؤں کی
اس رستے میں پیچھے سے اتنی آوازیں آئیں جمالؔ
ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی

○☆○

پس منظر سے واقف تھا اس لیے گھبرائے بغیر آزاد کو کرسی پیش کی تب کہیں جا کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا مگر اب کہاں کی غزل۔ اب یہ بتانا ضروری ہو گیا تھا کہ یہ حضرت ہیں کون اور جمال سے ان کا رشتہ کیا ہے پھر ہوا یہ کہ جمال کی غزل ایک طرف رہ گئی' حضرت آزاد سے غزل سنی گئی اور وہ بھی ترنم کے ساتھ۔ اس نے اس وضاحت کے ساتھ غزل سنائی کہ غزل اس نے خود بنائی ہے۔ ترنم استاد نے یعنی جمال نے سیٹ کیا ہے۔

غزل ختم ہوئی تو یوسف جاوید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک غزل کی اور فرمائش کر دی۔

"حضرت' دل نہیں بھرا' ایک غزل اور ہو جائے۔"

"ابھی پرسوں تو شاعری شروع کی ہے' دوسری غزل کہاں سے لاؤں۔ نئی بناؤں گا تو سناؤں گا۔"

وہ شخص باتیں اتنی دلچسپ کرتا تھا کہ سب لوگ شاعری بھول کر اس کی باتوں میں گم ہو گئے۔

شکیل احمد نیا نے توجہ دلائی تو یاد آیا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ وقت تو زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن انجم فوقی بزرگ آدمی تھے' انہیں گھر جانا تھا۔ اس لیے محفل برخواست کرنی پڑی۔

واپسی میں انجم فوقی بھی اسی رکشا میں لد گئے۔ انہیں گھر چھوڑنے کے بعد جمال کے گھر پہنچے۔ خیال تھا کہ آزاد ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا لیکن وہ تو ہمارے اندازے سے بڑھ کر شاعر نکلا۔

"ایک رات استاد کی خدمت میں بھی گزر جائے تو زندگی بن جائے گی۔"

اس نے نعرہ لگایا اور رکشا گلی میں کھڑی کر کے خود گھر میں چلا آیا۔

"یار' یہ کیا مصیبت گلے لگائی؟" میں نے جمال سے کہا۔

"مفت کی سواری' ڈرائیور سمیت مل گئی ہے اور تم اسے مصیبت کہہ رہے ہو۔"

"اب یہ رات بھر کان کھائے گا۔"

"چائے بنائے گا' کان کیا کھائے گا۔"

"غریب آدمی ہے' اسے روزی کمانے دو۔"

"میں تو صبح دفتر بھی اسی کے رکشا پر جاؤں گا۔"

میں کپڑے بدلنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ جمال کے پاؤں داب رہا تھا۔ یہ تھی استاد کی خدمت۔

"استاد' اب میں شاعر ہو گیا ہوں؟"

"اس میں کیا شک ہے۔" جمال نے کہا۔

"اب لوگ مجھ سے فرمائشیں کرتے ہیں اور غزل میرے پاس ایک ہے۔ خلیل ٹونکی کہہ رہے تھے' میرے شاگرد ہو جاؤ وہ مجھے روز ایک غزل دیتے۔ اس سے تو اچھا تھا میں ان کا شاگرد ہو جاتا۔"

جمال نے سواری ہاتھ سے جاتی دیکھی تو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم جا کر چائے بناؤ' ہم غزل تیار کرتے ہیں۔"

"اچھا استاد۔"

آزاد چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں گھس گیا اور جمال نے کاغذ' قلم سنبھالا۔ ہم دونوں نے مل کر غزل کہنا شروع کی۔

آزاد چائے بنا کر لے آیا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا غزلیں بننے کا انتظار کر رہا تھا۔

ہم نے دو غزلیں لکھ کر اس کے حوالے کیں "فی الحال ان سے کام چلاؤ۔"

"استاد' ان کا ترنم تو سیٹ کروا دو۔"

"ہمیں نیند آ رہی ہے۔" جمال نے کہا "صبح تمہارے ساتھ دفتر جانا ہے۔ راستے میں ترنم بھی سیٹ ہو جائے گا۔"

"استاد' رکشا پر میکلوڈ روڈ؟"

"تو کیا ہوا۔ پرسوں مشاعرہ بھی تو ہے۔ تمہارا نام لکھوا دیا ہے۔"

"سچ استاد؟" وہ خوش ہو گیا مگر مرے ہوئے دل سے کہا "ٹھیک ہے استاد' چھوڑ آؤں گا آپ کو دفتر بھی۔"

"چھوڑ آؤں گا کیا؟ وہاں کیا سواریاں نہیں ہوتیں؟ دوپہر تک دھندا کرنا پھر دونوں ساتھ ہی آ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے دفتر میں ایک غزل تمہارے لیے اور ہو جائے۔"

جمال نے دانہ پھینکا' پرندے نے بازو سمیٹے۔ اب صیاد کی مرضی کہ رکھے یا رہا کر دے۔

گھوڑا گھاس سے دوستی کر لے تو بھوکا ہی مرے گا۔ آزاد بھی مہینے بھر ہی بے گاری کا یہ بوجھ اٹھا سکا۔ ایک دن ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"استاد' چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ رکشا کا مالک رات کو بھاڑا مانگتا ہے' غزلیں نہیں۔ یا تو اسے بھی شاعر بنا دو یا یہ اپنی غزلیں واپس لے لو۔"

اس نے جیب سے غزلیں نکالیں اور جمال کے قدموں میں رکھ دیں۔ جمال کا چہرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

"چلو' اجمیری ہوٹل تک تو چلو پھر بات ہو گی۔"

"پندرہ روپے ہوں گے استاد۔"

"آج تو یار....."

"نہیں استاد' ہو چکا مذاق۔"

جمال کو مجبوراً پندرہ روپے کے وعدے پر اجمیری ہوٹل آنا پڑا۔ آزاد نے اسے ہوٹل پر اتارا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی ملتا استاد کی خیریت ضرور پوچھتا۔

اجمیری ہوٹل میں ہزار خوبیاں تھیں لیکن ایک خامی بھی تھی۔ ہوٹل کے مالک کو شاید نیند زیادہ آتی تھی۔ دن بھر یہ ہوٹل جس سرگرمی سے کھلا رہتا تھا' رات کو اتنی ہی بے دلی سے بند ہو جاتا تھا۔ جمال' آزاد کی طرف سے بھی مایوس ہو گیا تھا لہٰذا اب اس نے باقاعدگی سے جاوید کلینک جانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر جاوید کی شخصیت ایسی باغ و بہار تھی کہ جمال ان کے ہاتھوں بے دام فروخت ہو گیا۔ اتنی باقاعدگی سے وہ کورنگی میں کسی کے پاس نہیں بیٹھا ہو گا جتنا جاوید کلینک پر بیٹھا۔ یہ کلینک اس کے گھر سے بہت فاصلے پر تھا لیکن وہ بڑی پابندی سے یہاں آتا اور رات گئے سوکوارٹر کی طرف سدھار جاتا۔

اس کی فطرت میں جلد بازی نہیں تھی لیکن اضطراب بہت تھا۔ اتنا اضطراب کہ اگر کہیں سے اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا تو کرسیاں بدلتا رہتا تھا۔ ابھی ایک کرسی پر بیٹھا ہے' تھوڑی دیر میں دوسری کرسی سنبھال لی۔ کبھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا' کبھی ٹہلنے لگا۔ ایک مقام پر زیادہ دیر تک نہیں رک سکتا تھا۔ ایسا مضطرب آدمی تبدیلیوں کے لیے نت نئے ڈول ڈالتا رہتا ہے۔ جاوید کلینک کا پڑاؤ اسے راس آ گیا تھا لیکن تبدیلیاں تو یہاں بھی لا سکتا تھا۔ مشاعروں کی نئی تکی بھاگ دوڑ سے تنگ آ کر اس نے ایک نئی تفریح ڈھونڈ نکالی اور بہت دن بہت سوں کو اس کا خوگر بنائے رکھا۔

"ہم کیا مشاعروں کے لیے پیدا ہوئے ہیں' طرحی مشاعروں کی دہلیز پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے؟" ایک دن اس نے کہا۔

"یار' شاعر کا امتحان مشاعرے ہی میں ہوتا ہے۔" یوسف جاوید نے کہا۔

"امتحان کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایسے طریقے جن کا کچھ فائدہ بھی ہو۔"

"پیارے' آج ہو ہی جائے۔ کوئی طریقہ بتا ہی دے۔" یوسف جاوید نے پھر کہا۔

"ایسا کرتے ہیں' ایک مصرع دیا جائے اور سب اس پر... فی البدیہہ اشعار کہیں۔ ایک گھنٹے کا وقت دیا جائے۔ دیکھیں اس

مدت میں کون کتنے شعر کہتا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو وہی طرحی مشاعرہ ہوگیا۔" نور احمد نے کہا۔

"طرحی مشاعرہ کیسے ہوگیا۔ یہ تو زود گوئی کا مقابلہ ہوگا۔ ہم تو... فی البدیہہ شعر کہیں گے اور وہ بھی ایک مدت میں۔ اس سے مشقِ سخن میں اضافہ ہوگا۔"

یہ تجویز منظور کرلی گئی۔ طے یہ ہوا کہ ہر ہفتے کی رات کو ڈاکٹر جاوید اپنی بیوی کو میکے بھیج دیں گے۔ یہ مقابلہ خالی گھر میں منعقد ہوگا۔

"اور صبح کو نہاری کا ناشتا ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ہوگا۔" جمال نے کہا۔

ڈاکٹر جاوید نے پان کی پیک تھوک کر اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ بلند کیا اور نہاری کا معاملہ طے ہوگیا۔

معاملہ نہاری کا تھا اس لیے ہر شاعر کو دعوت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس مشقِ سخن کو صیغہ راز میں رکھنا ضروری تھا۔ قرعۂ فال جن شاعروں کے نام نکلا ان میں محسن اسرار، انور جاوید ہاشمی، یاد صدیقی، جمال احسانی، میں اور ڈاکٹر صاحب تھے۔ نور احمد میرٹھی اس معصوم بچے کے طور پر بلائے گئے جس کا کام کسی دیوان سے مصرع نکال کر دینا تھا۔

ہفتے کی رات کو جمال کی سربراہی میں تمام مدعو شعرا خالی گھر میں بھر گئے۔ نور احمد نے مصرع نکالا اور ہم نے کاغذ قلم سنبھالا۔

ایک گھنٹے بعد سب نے قلم رکھ دیے۔ سب نے اپنے اشعار کی تعداد بتائی اور پھر ان غزلوں پر مبنی مشاعرہ منعقد ہوا۔

سب سے زیادہ اشعار انور جاوید ہاشمی اور محسن اسرار نے کہے۔ تیسرا نمبر میرا تھا۔ جمال کے اشعار سب سے کم تھے۔ ایسے مقابلوں میں تعداد کی اہمیت ہوتی ہے، معیار کی نہیں۔ یہی بات جمال کو کھل گئی۔ انور جاوید ہاشمی اس سے زیادہ شعر کہے، یہ اسے برداشت نہیں ہوسکتا تھا۔

"یار، اس کا مطلب ہے اچھے شعر کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ دونوں غزلیں سامنے رکھ دو اور پھر دیکھو اچھے اشعار کی تعداد کس کی غزل میں زیادہ ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ بس گنتی بڑھالی، کوئی شعر ڈھنگ کا بھی ہے۔ ہٹاؤ بھی۔"

یہ بات اس کی سمجھ ہی میں نہیں آرہی تھی کہ زود گوئی کا مطلب تعداد ہوتا ہے، معیار نہیں۔

ایک ہی مقابلے کے بعد اس کی طبیعت اس طرف سے ہٹ گئی تھی۔ دو چار ہفتے یہ کھیل محض نہاری کے لالچ میں اس نے برداشت کرلیا ورنہ وہ پہلے ہی دن تائب ہوجاتا۔ ہر ہفتے جب نتیجہ یکساں برآمد ہوا تو اس نے کھیل ختم پیسہ ہضم کا اعلان کردیا۔ اسے اپنی شکست برداشت ہی نہیں تھی حالانکہ یہ تو شکست بھی نہیں تھی۔

غزل

عشق میں خود سے محبت نہیں کی جاسکتی
پر کسی کو یہ نصیحت نہیں کی جاسکتی
کنجیاں خانۂ ہمسایہ کی رکھتے کیوں ہو
اپنے جب گھر کی حفاظت نہیں کی جاسکتی
کیسے وہ بستیاں آباد کریں گے جن سے
در و دیوار کی عزت نہیں کی جاسکتی
کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جاسکتی
طائرِ یاد کو کم تھا شجرِ دل ورنہ
بے سبب ترکِ سکونت نہیں کی جاسکتی
اک سفر میں کوئی دوبار نہیں لٹ سکتا
اب دوبارہ تری چاہت نہیں کی جاسکتی
کوئی ہو بھی تو ذرا چاہنے والا تیرا
راہ چلتوں سے رقابت نہیں کی جاسکتی
آسماں پر بھی جہاں لوگ جھگڑتے ہوں جمال
اس زمیں کے لیے ہجرت نہیں کی جاسکتی

○☆○

○☆○

بھری ہوئی بس میں بعض مسافر جم کر کھڑے ہوجاتے ہیں، بعض کو جگہ بنانے کا ہنر آتا ہے۔ اسے جگہ بنانے کا ہنر آتا تھا۔ خوشامد نہیں، اپنی ذہانت سے۔ وہ آسمان پر گھرے ہوئے بادل کی طرح کچھ دیر زمین کو دیکھتا رہا اور پھر ایسا ٹوٹ کر برسا کہ سب کو اپنی محبتوں سے شرابور کرگیا۔

اس نے جب مشاعروں میں آنا شروع کیا تو سہما سہما رہتا تھا لیکن جلد ہی اس نے یہ راز جان لیا کہ اپنی عمر کے کچے پکے شاعروں میں بیٹھے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سکہ بند بااثر شعرا کو شیشے میں اتارنا چاہیے۔ اک اک مُہرا اس خوب صورتی سے چلا کہ ہر ہاتھ کو مات دے گیا۔ وہ اساتذہ وقت جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، اسے اپنے سر پر بٹھانے لگے۔ اب وہ مشاعرے پڑھتا نہیں تھا، مشاعرے مارتا تھا۔ کورنگی، لانڈھی کے مشاعرے اس کے لیے وہ ڈومنی بن گئے تھے جسے غالب نے اپنی جوانی میں مار رکھا تھا۔ وہ مشاعرے میں پہنچتا تو بزرگ اسے پہلو میں جگہ دیتے۔ اس کے مصرعے اٹھاتے۔ بزرگوں کی آنکھیں دیکھ کر نوجوانوں کا لہو بھی گرم ہوجاتا تھا۔ وہ شعروں کی اشرفیاں سونے کے تھالوں میں رکھ رکھ کر اچھالتا رہا۔ مقبولیت کے پھول اس کے گلے کا ہار بنتے رہے۔

اس کی شاعری میں ابھی کوئی انفرادیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پیدا ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ ابھی اسے شاعری شروع کیے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ انفرادی شان پیدا نہیں ہو سکی تھی لیکن محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا لہجہ آوازوں کی بھیڑ میں گم ہونے والا نہیں۔ ایک خوشبو نہیں تھی جو بند کلی سے آزاد ہونے کے لیے موسم بہار کے انتظار میں تھی۔ وہ درد دل خریدتا پھر رہا تھا کہ بجھی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ بنا سکے۔ کئی دروازے کھل گئے تھے' آنچل بھیگنے لگے تھے' آنکھیں راہ تک رہی تھیں' ہاتھوں کی کٹوریاں دعا سلام کے تقاضے نبھا رہی تھیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر پردے والیوں کو غزلیں سنانے کے دن تھے۔ فرمائشیں آتی تھیں' رقعے چلتے تھے۔ اب یہ دعا مانگنے کے دن تھے۔

کوئی خدائی ہمیں دے نہ بادشاہت دے
جو دے سکے تو بس اس کی گلی سے نسبت دے

وہ ایک گلی کی دعا مانگ رہا تھا مگر حال یہ تھا کہ ایک گلی اس پر کئی گلیوں کے راز افشا کر رہی تھی۔ وہ ایک دروازے پر دستک دیتا اور کئی دروازے ایک ساتھ کھل جاتے۔ اب اس کے شب و روز میں دوستوں کے لیے کم گھڑیاں رہ گئی تھیں۔

اس کا فطری اضطراب اب اسے ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ وہ بے وفائیوں کے تمغے سینے پر سجائے ایک شاخ سے دوسری شاخ کا سفر طے کرتا رہا۔ وعدہ خلافیوں کے رنگین گناہ سرزد ہوتے رہے۔ ایک آدمی کتنے محاذوں پر لڑ سکتا ہے۔ ایک زمانے میں اس ہجوم دلبراں نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ اس کی فطری تیز رفتاری نے اسے بچالیا ورنہ وہ اسی وقت ٹوٹ کر بکھر چکا ہوتا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اس کے اندر ایک ہرجائی چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے خوب واقف تھا۔

ہم اپنا لکھا ہوا کاٹ دیتے ہیں اکثر
ہمارا ٹھیک نہیں ہے کہ کب بدل جائیں

کتنے ہی نام اس سے منسوب تھے۔ نہ جانے کتنے خط اس کی بیاض کی زینت بن گئے تھے مگر اس کی غفلت نے اسے اکثر بچالیا۔

مرا مکاں مری غفلت سے بچ گیا ورنہ
کوئی چرا کے مرے بام و در چلا جاتا

اس غفلت کے باوجود اسے رات کا جادو' کمانیوں کے شاہ زادوں کی طرح بستر سمیت چھتوں چھتوں لیے پھرتا تھا۔ سحر نمودار ہوتی' رات کا جادو ٹوٹتا تو وہ نیند کا خمار اور بچھڑنے کا افسوس لیے اپنے گھر کی طرف لوٹ جاتا۔

کوچے سے ترے نکل رہا ہوں
میں صبح سویرے ڈھل رہا ہوں

زلف و مژہ کے سائے سائے اس کی شاعری پروان چڑھ رہی تھی لیکن وہ پریشان تھا کہ کڑی میں جتنے رنگ ہوتے ہیں اسے بات کہنے کے اتنے ڈھنگ کیوں نہیں آتے۔ اس کی شاعری دوسروں سے مختلف ضرور ہے لیکن بہت مختلف کیوں نہیں۔ جتنی جم کر وہ گفتگو کرتا ہے' اتنی فصاحت اس کے شعروں میں کیوں نہیں ہے۔ اس کا انداز اکھڑا اکھڑا کیوں ہے۔ وہ غافل تھا لیکن اپنی شاعری کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اسے اپنی کم علمی کا شدت سے احساس تھا۔

"یار' ہم لوگ کچھ پڑھتے پڑھاتے ہی نہیں ہیں۔" ایک دن اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

"یہ تو تمہارے سوچنے کی بات ہے۔" میں نے کہا "میں تو اردو ادب میں ایم اے کر رہا ہوں۔ تم نے انٹر کرنے کے بعد سب کچھ لپیٹ کر رکھ دیا۔ معاشقوں کے گلشن سے نکلو تو کتب میں داخل ہو۔"

"ابے کہاں کے معاشقے۔" وہ بے پروائی سے ہنسا "تو ٹھہرا عالم فاضل۔ ایسا کرتے ہیں' ساتھ بیٹھ کر کتابیں پڑھا کریں گے پھر اس پر بحث کریں گے۔ شاید کچھ روشنی ملے۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بی۔ اے میں رجسٹریشن کرالو۔ اس بہانے کچھ پڑھ بھی لو گے۔"

"ابے مجھے اس رسمی تعلیم سے چڑ ہے۔ اپنے طور پر پڑھیں گے یار۔"

"چل تو پھر کل سے شروع کیے دیتے ہیں۔"

"کل سے تم باقاعدگی سے شام کو یہاں آؤ گے۔" اس نے کہا۔

"آتا ہی ہوں اور باقاعدگی سے آجاؤں گا۔"

"کل آؤ تو کوئی کتاب اٹھاتے لانا۔"

ابھی اس نے کتابیں خریدنا شروع نہیں کی تھیں اس لیے اس کی یہ فرمائش بے جا بھی نہیں تھی۔

دوسرے دن میں نے نیاز فتح پوری کی "مشکلات غالب" اٹھالی اور اس کے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں عالم عظیم آبادی کا گھر پڑتا تھا۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرا اور پھر جمال کے گھر پہنچ گیا۔

"مصطفےٰ" اس نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو آواز دی "سگریٹ لا۔ یار آیا ہے آج۔" پھر اس نے کتاب کا نام پڑھا "کتاب تو اچھی لے آیا۔ ابے ایسی ایسی کتابیں رکھتے ہو کبھی انہیں پڑھ بھی لیا کرو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں پڑھتا نہیں ہوں؟"

"پڑھ لی ہوتیں تو ایسی شاعری نہیں کرتے جیسی کرتے ہو۔" اس نے جملہ کسا اور کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں مصطفےٰ سگریٹ کا پیکٹ لے کر آگیا۔

"ایک ایک سگریٹ ہو جائے پھر پڑھیں گے۔" اس نے اور میں نے ایک ساتھ سگریٹ جلائے اور باتیں کرنے لگے۔

"ابے یاد آیا۔" وہ لیٹا ہوا تھا' اٹھ کر بیٹھ گیا "یار' ایک شاعر لاہور سے آیا ہے' الیاس شاداں۔ کیا قیامت کے شعر لکھتا ہے۔ ابے سنو گے تو غش کھا جاؤ گے۔ کہو گے' اسے کہتے ہیں جدید شاعری۔ بالکل اور یجنل شاعری ہے۔ وضع قطع سے بھی شاعر ہی لگتا ہے۔ یار'

شاعری تو لاہور میں ہو رہی ہے۔ شاداں کو سن کر تو مجھے یہی لگا۔ ہم لوگ سالے مشکلات غالب میں لگے ہوئے ہیں۔ شاعری کتابوں سے نہیں آتی یار۔"

"ہو سکتا ہے مشکلات غالب پڑھ کر ہی اسے ایسی شاعری کرنا آئی ہو۔"

"ابے چل۔ مشکلات غالب پڑھ کر کوئی کرے گا ایسی شاعری۔ لاہور کا پانی ہے یار لاہور کا۔"

"ویسے ایک بات ہے جمال۔" میں نے کہا "تمہارا خون بہت ہلکا ہے۔ جس سے ملتے ہو اتنی جلدی متاثر ہو جاتے ہو کہ سوچنے کی مہلت بھی نہیں لیتے۔"

"یار اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ اس کا شعر سن۔"

ہم سائے کے اشجار بھی سایہ نہیں دیتے
رہتے ہیں مرے گھر میں کرایہ نہیں دیتے

"ایک آدھ شعر تو سب ہی کے ہاں اچھا نکل آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک آدھ شعر نہیں، غزلیں کی غزلیں ایسی ہی ہیں۔ کبھی ملو گے تو سنوا دوں گا۔"

"تمہیں وہ حضرت مل کہاں گئے؟"

"دو تین دن پہلے میں یوسف جاوید کی طرف گیا تھا۔ وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ کل میں نہ جانے کس دُھن میں تھا، تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ مشکلات غالب دیکھ کر یاد آیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک سگریٹ کی مہلت مانگی تھی، ہم اس گفتگو میں ڈوب کر دو، تین سگریٹ پی چکے تھے۔

"چل یار، کچھ پڑھ لیں۔"

"ایسے کیسے، پہلے چائے تو پی لے۔" وہ پھر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے اس نے ہانک لگائی "مصطفےٰ! بیٹا، چائے تو پلا دے۔"

مصطفےٰ نے مجھے دیکھتے ہی شاید چائے کا پانی رکھ دیا تھا کہ فوراً ہی چائے آگئی۔

چائے ختم ہوئی تو پھر ضروری ہو گیا کہ سگریٹ جلائی جائے۔

"یہ نیاز فتح پوری چیز کیا تھے؟ ایسے لوگوں کو تو نے ہی پڑھ رکھا ہے، ان کا حدود اربعہ تو معلوم ہو پھر ان کی کتاب پڑھی جائے گی۔"

میں جو کچھ ان کے بارے میں جانتا تھا، بتاتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کیے سنتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آؤ الیاس شاداں کی طرف چلتے ہیں۔"

"تم نے تو کہا تھا، سارے کام ختم، بس اب پڑھائی ہو گی۔"

"کل سہی، بس اب شاداں سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔" اس نے چپل پاؤں میں ڈالے اور مجھے لے کر باہر نکل آیا۔

شاداں کا گھر قدموں کی دوری پر تھا اس لیے اس نے سواری کا انتظام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ راستے میں بھی اس کا موضوع الیاس شاداں تھا۔ گلیوں میں رستے بناتا ہوا بالآخر وہ مجھے شاداں کے گھر تک لے آیا۔

ہماری عمروں سے کچھ نہیں تو دس بارہ برس آگے کا آدمی گھر سے باہر آیا۔ سفید براق ململ کا کرتہ پاجامہ، اس کے خوب سیاہ رنگ کے سامنے خوب سفید نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ میں رومال دبا ہوا تھا اور پاؤں میں سلیم شاہی۔ وہ نہایت دبلا پتلا تھا۔ ایسا کہ پسلیاں گن لیں۔ قد متناسب تھا ورنہ اور بھی دبلا لگتا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرخی نمیں پیلاہٹ جھلک رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی آنکھیں بے حد متاثر کن تھیں۔ چوڑی پیشانی، سیاہ بال کسی قدر گھنگریالے۔ وہ شاید کہیں جانے کی تیاری میں تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی پھر جمال کو دیکھا۔ سچی بات یہ کہ میں اس سے قطعی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے بھی مجھ سے رسمی طور پر ہاتھ ملایا البتہ جمال کو دیکھ کر خوش ہوا۔

"ان سے ملو، یہ ہیں ہمارے دوست ساجد رام پوری۔" جمال نے میرا تعارف کرایا۔

"اچھا تو تم ہو ساجد رام پوری!" اس نے اس طرح کہا جیسے میرے دھوکے میں وہ اب تک کسی اور سے ملتا رہا ہو۔

"آپ کتنے دن سے ہیں کورنگی میں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مہینہ ہو گیا۔" اس نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تم جمال جیسے لوگوں سے ملنے میں ضائع ہوتے رہے ہو۔ معقول لوگوں سے ملتے تو مجھ سے مل چکے ہوتے۔"

بات مذاق کی تھی لیکن پہلی ملاقات کی مناسبت سے اس نے اسے میری بدتہذیبی سمجھا ہو گا۔ اسی لیے اس کے چہرے پر سنجیدگی آگئی۔

"گھر میں بیٹھو گے یا کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھیں؟" اس نے

"نعت"

شاہِ زباں کا تذکرہ کرنے کا وقت ہے
یہ وقت ہی تو جاں سے گزرنے کا وقت ہے
گھر سے مسافروں کے نکلنے کی ہے گھڑی
راہوں میں خوشبوؤں کے بکھرنے کا وقت ہے
اس وقت ایک دھیان ہے اور ان کا دھیان ہے
یہ وقت دل کو آئینہ کرنے کا وقت ہے
اے راہِ شوق مجھ کو پہنچنے کی ہے لگن
چلنے کا وقت ہے نہ ٹھہرنے کا وقت ہے
وہ وقت ہے اذان میں اس نام کے لیے
تصویر میں جو رنگ کے بھرنے کا وقت ہے
باشندگانِ ارضِ وطن پر جمالؔ اب
اللہ کے رسولؐ سے ڈرنے کا وقت ہے

○☆○

کہا۔

"گھر چلتے ہیں۔" جمال نے کہا۔

"ابھی تو گھر سے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھیں گے۔"

جمال کی یہ عجیب عادت تھی۔ وہ کہیں چلا جائے' گھر سے دور نہیں ہونے پاتا تھا۔ یوں کہنے کو کتنی ہی راتوں کے لیے غائب ہو جائے لیکن لگتا یہی تھا کہ گھر جانے کے لیے پر تول رہا ہے پھر یہ کہ چاہتا تھا پوری دنیا اس کے گھر کا رخ کرے۔ جس سے ملاقات ہوتی تھی اسے گھر چلنے کی دعوت ضرور دیتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب وہ گھر میں اکیلا داخل ہوتا ہو۔ وہ کہتا تھا' اکیلے گھر میں میرا رونے کو جی چاہتا ہے۔ اکیلے گھر میں شاید اسے پل دو پل ہی سونے کو ملتا ہوگا۔

آج تو گھر میں کوئی نہیں ہے' آج تو کھل کر رو لیں گے
رو رو کر تھک جائیں گے تو پل دو پل کو سو لیں گے

اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ گھر والوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر میں تنہائی دیکھتا تھا۔ اس کی تنہائی دوستوں کی موجودگی سے دور ہوتی تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ سب بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور وہ سو گیا۔ دوستوں کی موجودگی اس کے لیے تفریح کا سامان نہیں' تحفظ کا احساس بن جاتی تھی۔

جن راستوں پر چل کر ہم آئے تھے' انہی راستوں سے ہوتے ہوئے ہم واپس جمال کے گھر پہنچ گئے۔ بس یوں لگا جیسے دو بچے بازار سے کھلونا خریدنے گئے تھے اور اس کھلونے کا نام تھا الیاس شاداں۔

گھر پہنچتے ہی پھر مصطفےٰ کی ڈیوٹی لگ گئی۔ سگریٹ لاؤ' چائے بناؤ۔ خبردار' سومت جانا۔ کیا خبر کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔

وہ خود تو چاروں شانے چت دراز ہو گیا اور شاداں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ شعر سنائے۔ شاداں کے اشعار جتنے اچھے تھے' پڑھنے کا انداز اتنا اچھا نہیں تھا لیکن جمال تو قتیل شفائی تھا۔ ہر شعر پر داد کی اشرفیاں اچھال رہا تھا اور بیچ بیچ میں مجھے بھی متوجہ کرتا جا رہا تھا "یہ ہوتی ہے شاعری۔"

اس ملاقات میں شاداں کی شاعری سے زیادہ مجھے اس کی عجز پسند فطرت اور بے لوث ہنسی نے متاثر کیا۔ مجھے لگا کہ وہ دوستی کرنے کے لائق ہے۔

اس کے بعد شاداں سے میری تو خوب نبھتی رہی لیکن جمال چند دن اس کے حصار میں رہنے کے بعد صحیح سلامت واپس آ گیا۔ صحیح سلامت اس لیے کہ اس نے سوچ سوچ کر کرایہ' مکان' پھل' کیل' کانٹے جیسے الفاظ اپنی دو ایک غزلوں میں استعمال کیے اور پھر خود ہی اکتا گیا۔

"شاداں کے پاس خیالات تو اچھے ہیں مگر مصرعے کچے لکھتا ہے۔ کیا خیال ہے؟" ایک دن اس نے کہا۔

"مگر تم تو اس کی شاعری پر ایسے لٹو ہو رہے تھے کہ خدا کی پناہ!"

"یار' کمزور لمحے بھی تو آتے ہیں انسان پر۔" وہ اپنے اوپر خود ہنسنے لگا "حقیقت یہ ہے کہ پائیدار شاعری وہی ہے جو ہم تم کرتے ہیں۔"

"اور تم بھی کیا۔ شاعری وہی ہے جو میں کرتا ہوں۔"

"مذاق چھوڑ یار' غزل سن اور داد دے اپنے یار کو۔" اس نے غزل شروع کی۔

یہ بساطِ ہستی ہے مُہرے آزما کے چل
ایک گھر گنوا کے جا ایک گھر بچا کر چل
زیرِ دام آنے میں ہم ذرا نہ چوکیں گے
بات تو بنا کے کر چال تو چھپا کے چل
کم نہیں ہے منزل سے راستے کی سنگت بھی
ساتھ کچھ تجرکا دے ساتھ کچھ ہوا کے چل
ربط بھی نہ ٹوٹے گا ساتھ بھی نہ چھوٹے گا
اپنی گمرہی کو اَب ہم سفر بنا کے چل
ذات بھی صداقت ہے کائنات بھی سچ ہے
ایک قدم الگ سب سے اک قدم ملا کر چل

کسی خزانے کی کنجی اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس غزل سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ یہ غزل اس کی پچھلی تمام غزلوں سے مختلف تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چلتے چلتے اچانک دوسرے راستے پر آ گیا ہو۔ اس غزل میں وہ تمام امکانات موجود تھے جو اچھی شاعری کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اب تک اس کی غزلیں ناہمواری اور ناپختگی کا شکار ہوتی تھیں لیکن اس غزل میں وہ پختگی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لفظوں کے کلاسیکی برتاؤ کا احساس گہرا ہو گیا تھا لیکن ایک آنچ کی کسر اب بھی نظر آتی تھی۔

میں نے جو محسوس کیا اس کے گوش گزار کر دیا۔ یہ بھی اس کے کان میں ڈال دیا کہ مطالعے کی کمی ہی وہ آنچ ہے جس کی کسر رہ گئی ہے۔

"تم کیا سمجھتے ہو' میں مطالعہ نہیں کرتا؟ میر تقی میر کی ہوا لگی ہے تمہیں؟"

"میر کو پڑھا ضرور ہے لیکن رہتا میں اپنی ہوا میں ہوں۔"

"گرو گے سالے منہ کے بل۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹین کے صندوق میں ہاتھ ڈال کر ایک کتاب نکالی۔ یہ کلیاتِ میر تھی جو اس کے ہاتھ کہیں سے لگ گئی تھی۔ یہ غزل شاید اس کے مطالعے کی دین تھی۔

"چند غزلیں کورس میں پڑھ لی ہوں گی۔ اس کے کلیات کو اگر دھیان سے پڑھ لو تو چودہ طبق روشن ہو جائیں۔"

یہ سچی بات تھی کہ کلیاتِ میر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کئی غزلیں پڑھیں۔ اشعار کے معنی پر بھی بحث ہوتی جا رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہ ان اشعار کو عجیب

عجیب رخ سے دیکھ رہا ہے۔ لفظی خوبیوں کو اس چابک دستی سے بیان کررہا تھا کہ میں اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ دراصل وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کتاب کے کیڑے نہیں ہوتے لیکن ایسی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں کہ سرا ہاتھ آجائے تو ڈور سلجھا لیتے ہیں۔ جب ہم نے ایک کتاب "تخیل اور شاعری" ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھی تو اس نے بعض ابواب کی تشریح ایسے آسان لفظوں میں کی کہ مصنف بھی بعض نکتوں کو اس خوب صورتی سے نہیں سمجھا سکتا تھا جس طرح اس نے سمجھا دیے بلکہ بعض نکات اپنی طرف سے ایسے اٹھائے جو کتاب میں بیان ہی نہیں ہوئے تھے۔

یہ وقفہ اضطراب عجیب آیا تھا۔ جب دیکھو ایک کتاب بغل میں دبائے نظر آتا تھا۔

ہم دونوں نے مل جل کر نہ جانے کتنی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ طریقہ یہ تھا کہ کچھ دیر میں پڑھتا اور وہ سنتا تھا' کچھ دیر وہ پڑھتا تھا اور میں سنتا تھا۔ اس طریقہ مطالعہ کا فائدہ مجھے تو شاید کم ہی ہوا ہوگا لیکن جمال تو کندن بن گیا۔ اس میں قوتِ جذب اتنی زیادہ تھی کہ جو پڑھتا تھا اسے اپنے لہو میں اتار لیتا تھا۔ اثر قبول کرلینے کا مادّہ اتنا تھا کہ جس دوست سے ملتا' اسی کا اندازِ گفتگو' چال ڈھال اختیار کرلیتا۔ کتابوں میں گم ہوا تو فاضلانہ تقریریں کرنے لگا لیکن وہ ایسا فاضل کبھی نہ بن سکا جو گریبان میں گردن ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اوّل و آخر شاعر تھا لہٰذا شرارت اور رنگینی' کاہلی اور بے نیازی اس کے ساتھ ساتھ پھرتی رہیں۔

وہ طرحی مشاعروں کا بڑا دشمن تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ مشاعرے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ کورنگی سے ملیر' سعود آباد تک طرحی شاعری کا دور دورہ تھا۔ اسے یہ دکھ رہتا تھا کہ طرحی غزلوں کے چکر میں اس کی اچھی غزلیں لوگوں تک پہنچنے سے رہ جاتی ہیں۔

اس نے چند ہم خیال تیار کیے اور طرحی مشاعروں کے خلاف صف آرا ہوگیا۔ یاد صدیقی ہماری اسٹریٹ پاور تھا کیونکہ وہ کسی زمانے میں باکسنگ سیکھ چکا تھا اور چھوٹی موٹی بدمعاشی بھی اس کے نام سے منسوب تھی۔ اگر کبھی لڑائی بھڑائی کا موقع آجاتا تو وہ کام آسکتا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ طرحی مشاعروں کو خراب کیا جائے اور باذوق سامعین کی ذہنی تربیت کی جائے۔

اس منصوبے کا پہلا شکار کورنگی نمبر ا کی مارکیٹ کی چھت پر ہونے والا طرحی مشاعرہ تھا۔ اس علاقے کے ایک معمر ترین شاعر قیس مینائی کی صدارت تھی۔ آسان سا چھوٹی بحر کا مصرع طرح تھا لہٰذا اس سہولت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے طے کیا گیا کہ کم از کم چار شاعر اس زمین میں سو' سو شعر کہیں۔ یکے بعد دیگرے جب اتنی طویل غزلیں نذر مشاعرہ کی جائیں گی تو سامعین پر کیا بیتے گی اور شعرا پر کیا گزرے گی۔ یہ سوچ سوچ کر ہی ہنسی آتی تھی۔

شاہد لکھنوی' جمال اور میں ان طویل غزلوں کے لیے منتخب ہوئے۔ ہم نے دن رات ایک کرکے غزلیں کہیں اور مشاعرے میں

غزل

ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے
یا کچھ بھی نہیں ہونے کا ادراک بہت ہے
اِک بھولی ہوئی بات ہے اِک ٹوٹا ہوا خواب
ہم اہلِ محبت کو یہ املاک بہت ہے
کچھ دربدری راس بہت آئی ہے مجھ کو
کچھ خانہ خرابوں میں مری دھاک بہت ہے
پرواز کو پر کھول نہیں پاتا ہوں اپنے
اور دیکھنے میں وسعتِ افلاک بہت ہے
تنہائی میں جو بات بھی کرتا نہیں پوری
تقریب میں مل جائے تو بے باک بہت ہے
نادم ہے بہت تو بھی جمالؔ اپنے کیے پر
اور دیکھ لے وہ آنکھ بھی نم ناک بہت ہے

○☆○

کبھی دشت میں نہ غبارِ راہ میں دیکھتے
مجھے دن ڈھلے کسی خیمہ گاہ میں دیکھتے
ذرا دیر کردی جمالؔ ورنہ اسے تو ہم
کبھی بزم میں کبھی رزم گاہ میں دیکھتے

○☆○

پہنچ گئے۔

قیس مینائی بزرگ شاعر تھے اور مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ وہ اس مشاعرے کی صدارت کررہے تھے' اس لیے شعرا کی بڑی تعداد انہیں سننے اور اپنی سنانے کے لیے اس مشاعرے میں آئی ہوئی تھی۔ تقی دہلوی' صدر گرامی کے پہلو سے لگے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے بڑی شفقت سے اپنے پاس بلایا اور قیس مینائی سے ہمارا تعارف کرایا۔

"یہ دونوں بچے اس علاقے کی آبرو ہیں۔ بڑی اچھی اٹھان ہے۔ خوب نام روشن کریں گے۔"

قیس صاحب نے ہمیں درازیٔ عمر کی دعائیں دیں اور ہم اپنے "جتھے" کے ساتھ بیٹھ گئے۔ یاد صدیقی کسی ممکنہ خطرے سے ہمیں بچانے کے لیے چوکس بیٹھا تھا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ ہم تو مشاعرے کی آبرو قرار پاچکے تھے بلکہ علاقے کی آبرو تھے لہٰذا "ایسے ویسے" شاعر پڑھتے رہے۔

شاہد لکھنوی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ دعوت کتنی مہنگی پڑ جائے گی۔ وہ ترنم سے پڑھتا تھا اور پھر سو شعروں کی

شرط۔ دس پندرہ شعروں تک تو واہ واہ ہوتی رہی پھر خاموشی طاری ہوگئی اور اس کے بعد تو لوگ پہلو بدلنے لگے۔ مشکل سے پچاس شعر پڑھے گئے ہوں گے کہ سرگوشیاں سنائی دینے لگیں' چہرے بگڑنے لگے۔ ایک آدھ شاعر نے بلند آواز سے احتجاج بھی کیا کہ میاں ہم صرف تمہیں سننے نہیں آئے ہیں۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ مصرع طرح یاد ہے تو شعر بھی سنو۔ باتوں کی بھنبھناہٹ کی پروا کیے بغیر وہ پڑھتا رہا۔ اس نے غزل ختم کی تو اچھا خاصا مشاعرہ مچھلی بازار کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ سب اس پر برس رہے تھے اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"شاہد میاں' یہ تمہیں سوجھی کیا۔ اچھے خاصے مشاعرے کی ریڑھ مار کر رکھ دی۔" تقی دہلوی نے جھنجلا کر کہا۔

"اس میں سوجھنے کی کیا بات ہے۔ مشاعرے میں تو شعر پڑھے جاتے ہیں اور میں نے شعر پڑھے ہیں۔"

"شعر پڑھے ہیں مگر کوئی حد ہوتی ہے۔"

"شعر گننے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کوئی اور چاہے تو اس سے زیادہ پڑھ دے۔" شاہد نے کہا۔

اب یہی ہو سکتا تھا کہ وقفہ کر دیا جائے۔ وقفہ ہو گیا۔ فضا ایسی ہو گئی تھی کہ کچھ شعرا تو وقفے کے دوران میں ہی گھروں کو سدھار گئے' جو رہ گئے وہ اس اُمید میں بیٹھ گئے کہ اب مشاعرہ سدھر جائے گا۔

وقفہ ختم ہوا تو اس امید پر جمال کو بلایا گیا کہ یہ لڑکا مشاعرہ جما دے گا۔ جمال نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اللہ کا نام لے کر غزل شروع کر دی۔ مطلع پڑھا تھا کہ مشاعرہ اٹھ گیا۔ تقی دہلوی نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی "شاباش میاں۔ کیا کہتے ہیں۔" ایک آدھ شعر کے بعد قیس مینائی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

جب اس کی غزل نے بھی وہی رنگ دکھایا تو لوگ چوکنا ہوئے۔ جمال آنکھیں بند کر کے پڑھتا رہا اور لوگ کھسکتے رہے۔ ادھر یاد نے یہ حرکت کی کہ لوگوں سے کہنا شروع کر دیا' اس کے بعد جتنے شاعر آئیں گے اسی تعداد میں شعر پڑھیں گے۔ یہ سننا تھا کہ لوگوں کی ہمت جواب دے گئی۔ قیس مینائی کے لیے بھی اب یہ بدتمیزیاں ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔ انہوں نے جمال کو ایک طرف ہٹایا اور لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

"آپ جو تھوڑے سے رہ گئے ہیں' آپ بھی گھروں کو جائیں۔ میں مشاعرہ ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔"

"غزل تو ختم کرنے دیں قیس صاحب۔" جمال نے کہا۔

"کہیں اور جا کر ختم کیجئے۔ سن چکے بکواس آپ کی۔" قیس صاحب نے کہا۔

"مرضی آپ کی۔" جمال نے کہا اور دامن جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی بازپرس کرتا' ہم نے جوتیاں سنبھالیں اور زینہ اتر کر سڑک پر آ گئے۔ شعرا ابھی تک سڑک پر جمع تھے۔ ہم دوسرے راستے سے فرار ہو گئے۔

دوسرے دن ہم نے سنا کہ ہمارے فرار کی خبر ملتے ہی تمام بچے کھچے شاعر دوبارہ چھت پر چڑھ گئے۔ مشاعرہ پھر جم گیا۔ شوق ہو تو ایسا۔

دوسرے دن ہم سر جوڑ کر بیٹھے تو مجھے یہ افسوس تھا کہ میری محنت بے کار گئی۔ غزل پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس بات کا بھی افسوس تھا کہ ہماری کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ مشاعرہ تو پھر بھی ہوا لیکن پھر بھی ملے ہوا کہ ہمت نہیں ہارنی چاہیے' آئندہ کسی اور طریقے سے حملہ کرنا ہے۔

یہ ترکیب بھی جلد ہی سمجھ میں آ گئی۔ لانڈھی ایک نمبر کیونٹی سینٹر میں مشاعرہ تھا۔ طرح کا مصرع ملتے ہی ہم نے چند شعرا کے پاس خصوصی طور پر جانا شروع کر دیا۔ ان شعرا میں تقی دہلوی اور یوسف جاوید بھی شامل تھے۔ طرح کا مصرعہ مل چکا تھا لہٰذا ان ملاقاتوں میں اسی مصرع پر گفتگو ہوتی تھی۔ مشاعرہ قریب آنے لگا تو اشعار بھی سنائے جانے لگے۔ ہم تقی صاحب کے گھر گئے اور انہیں اعتماد میں لینے کے لیے اپنی اپنی غزلیں سنا دیں۔ شاعر کو کب برداشت کہ کوئی اسے اپنی غزل سنا کر چلا جائے اور وہ نہ سنائے۔ تقی صاحب نے بھی اپنی غزل سنا دی۔ ہم نے ایک ایک شعر کو کئی کئی مرتبہ سنا اور پروگرام کے مطابق ان اشعار کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ ان سے اجازت چاہی اور باہر نکلتے ہی ہم دونوں کو جتنے اشعار یاد آئے ہم نے کاغذ پر اتار لیے۔ یہی سلوک یوسف جاوید کی غزل کے ساتھ کیا۔ بے تاب نظیری کی غزل کے بھی پانچ شعر ہمارے ہاتھ لگ گئے۔

گھر پہنچ کر ہم نے فیض امروہوی کو بلایا۔

"فیض صاحب' غزل ہو گئی؟"

"آج ہی تو لایا ہوں۔ ظفر جون پوری صاحب کی اصلاح کے لیے دی ہوئی تھی۔ سناؤں؟" اس نے کہا اور لہک لہک کر غزل سنانا شروع کر دی۔

جمال ہر شعر پر ناک بھوں چڑھاتا رہا۔ غزل ختم ہوئی تو اس نے باقاعدہ ڈانٹنا شروع کر دیا۔

"ایسی غزلیں پڑھو گے تو کیا خاک ترقی کرو گے۔"

"جمال صاحب' آپ نے حد کر دی۔ ظفر جون پوری نے اصلاح دی ہے۔ کتنا اچھا مرثیہ لکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔"

"مرثیہ اچھا لکھتے ہوں گے لیکن یہ غزل ہے فیض صاحب اور مجھے تو لگتا ہے وہ تمہیں اصلاح بھی دل سے نہیں دیتے۔"

"اچھا!" فیض امروہوی نے بڑی معصومیت سے حیرانی کا اظہار کیا۔ "جمال صاحب' آپ نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی ہے۔ بہت دن سے خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ مشاعروں میں انہیں تو خوب داد ملتی ہے' میں رہ جاتا ہوں۔"

"وہ کب چاہیں گے کہ ان سے زیادہ داد ملے۔"

"کیا کروں جمال صاحب' یہ تو بڑے خطرے کی بات ہو گئی۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"کرنا کیا ہے' غزل ہم تمہیں دیں گے پھر دیکھنا کیسی دھوم مچتی ہے۔"

"لیکن کل ہی تو مشاعرہ ہے۔"

"غزل تیار ہے۔ اپنی غزل پھاڑ دو اور یہ لو نئی غزل۔"

ہم نے تینوں شاعروں کے اشعار ملا کر ایک غزل پہلے ہی تیار کر لی تھی۔ وہ غزل اس کے حوالے کر دی۔ کئی مرتبہ پڑھوا کر بھی دیکھ لی۔

"یہ ہے نا غزل۔ پورے پندرہ شعر ہیں۔ ظفر صاحب تو سات شعر دے کر بھگا دیتے ہیں۔" فیض امروہوی نے کہا۔

وہ بے چارہ اس چال کو کیا سمجھتا۔ خوش بھی ہوا اور جمال کا احسان مند بھی۔

"کل مشاعرے میں ہمارے ساتھ ہی چلنا۔" جمال نے کہا۔

"اب تو میں آپ کے ساتھ ہی جایا کروں گا۔" اس نے کہا۔

دوسرے دن وقت سے پہلے ہی فیض صاحب تشریف لے آئے۔

جمال جان بوجھ کر دیر لگا رہا تھا اور فیض صاحب کو بے چینی ہو رہی تھی۔ جب جمال نے حیلے بہانے سے رات کے دس بجا دیے تو فیض صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔

"آپ تو اچھے شاعر ہو گئے ہیں لہٰذا دیر میں نمبر آتا ہے۔ ہماری تو کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ زیادہ دیر کی تو نمبر ہی نکل جائے گا۔ سمجھتے ہیں نہیں اور دیر کیے جا رہے ہیں۔"

"کوئی نہیں ہوتی دیر۔ بیٹھے رہو اطمینان سے۔"

وہ اطمینان سے کیسے بیٹھ جاتے۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کو آپس میں رگڑ رہے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ کبھی ٹہلنے لگتے، کبھی بیٹھ جاتے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دسیوں مرتبہ غزل دُہرا چکے تھے مگر جمال کے کام ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔

"جمال صاحب، اب تو جانا ہی بے کار ہے، نمبر ہی نکل گیا ہو گا۔ آج کتنی اچھی غزل میرے پاس تھی۔ آپ کی وجہ سے میں مارا گیا۔"

فیض صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ان کی حالت دیکھ کر بالآخر جمال کو رحم آ گیا۔

"فیض صاحب، آپ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ جب بھی پہنچیں گے، آپ کا نمبر ضرور آئے گا۔"

"غلام غوث تو جل ہی جائے گا جب میں اساتذہ میں پڑھوں گا۔"

وہ اس طرح خوش ہو گئے جیسے بچہ روتے روتے ہنسنے لگتا ہے۔

ہم اس لیے دیر لگا رہے تھے کہ اگر فیض صاحب شروع میں پڑھ لیتے تو جن کی غزلیں ہم نے انہیں دی تھیں۔ وہ دوبارہ کچھ شعر کہہ سکتے تھے۔ ہم چاہتے تھے، فیض صاحب کے فوراً بعد ان کا نمبر آئے تاکہ انہیں موقع نہ مل سکے۔

ہم گھر سے نکلے تو فیض صاحب کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مشاعرے میں پہنچ کر بھی ہم نے پہلے یہ معلوم کر لیا کہ مشاعرہ کس منزل پر ہے۔ جب خوب مطمئن ہو گئے تو ہم فیض کو لے کر اندر پہنچ گئے۔

فیض صاحب کی غزل میں اشعار کی ترتیب ہم نے اس طرح رکھی تھی کہ پہلے یوسف جاوید کے اشعار تھے پھر تقی دہلوی کے اور آخر میں بے تاب نظیری کے۔

جمال نے سفارش کی اور فیض امروہوی کو بلا لیا گیا۔ انہوں نے جیسے ہی مطلع پڑھا یوسف جاوید کا منہ فق ہو گیا۔ انہوں نے سامنے رکھی ہوئی ڈائری اٹھائی اور اسے کھولا۔ غالباً وہ اپنی غزل دیکھ رہے تھے۔ فیض نے دوسرا شعر پڑھا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے گئے یوسف جاوید کا سرخ و سفید چہرہ بالکل سرخ ہو گیا۔ اب صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مارے غصے کے ان کا برا حال ہے۔ آدمی شریف تھے اس لیے ضبط کیے بیٹھے تھے پھر اچانک تقی دہلوی نے بل کھایا۔ ظاہر ہے اب ان کے اشعار پڑھے جا رہے تھے۔ یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ اب بے تاب نظیری کے اشعار کی باری تھی۔ دو تین شعروں تک تو وہ بھی چپ رہے لیکن وہ ذرا دبنگ آدمی تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور فیض کی طرف بڑھے۔

جمال نے یاد کو اشارہ کیا۔ وہ بے تاب نظیری کی راہ میں اس طرح حائل ہوا کہ وہ بروقت فیض امروہوی تک نہیں پہنچ سکے اور مظہر رام پوری نے جسے اسی کام کے لیے بٹھایا گیا تھا، فیض صاحب کو اسٹیج سے نیچے اتار دیا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے اس نے فیض امروہوی کو بتا بھی دیا کہ بے تاب صاحب تمہیں مارنے لیے آ رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی فیض صاحب خود بہ خود بھاگنے لگے۔

مظہر تو انہیں لے کر کہیں غائب ہو گیا اور ادھر بے تاب نظیری نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یوسف جاوید اور تقی دہلوی بھی برہم ہو گئے۔

"کس بے ہودہ آدمی نے یہ حرکت کی ہے۔" بے تاب نظیری نے غضب ناک آواز میں کہا "میرے شعر کسی نے فیض کے بچے کو دے دیے اور اس نے پڑھ بھی دیے۔"

"یہی حرکت میری غزل کے ساتھ بھی ہوئی ہے۔" تقی دہلوی نے کہا۔

یوسف جاوید کو بھی یہی شکایت تھی۔ دوسرے شاعروں نے بھی اس حرکت کی مذمت کی اور اسی وقت طے کیا گیا کہ فیض امروہوی کو کوئی اپنے مشاعرے میں نہ بلائے۔

بے تاب نظیری نے صاف اعلان کر دیا کہ مشاعرہ ختم کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی غزل میں آٹھ شعر تھے جن میں سے پانچ شعر وہ کم بخت فیض امروہوی پڑھ کر چلا گیا۔

زیادہ تر شعرا پڑھ ہی چکے تھے اس لیے کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا۔ اب جمال کو موقع مل گیا۔ اس نے بے تاب نظیری کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

"جناب، طرحی مشاعروں کا یہی نقصان ہے بلکہ عیب ہے۔ اگر یہ غیر طرحی مشاعرہ ہوتا تو اگر کوئی ایک غزل بھی چرا لیتا تو آپ دوسری پڑھ سکتے تھے۔ پانچ شعر اس نے چرا لیے تو آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اب ان طرحی مشاعروں کو ختم کیجیے اور موقع دیجیے کہ ہر شاعر اپنی صلاحیتوں کا آزادانہ استعمال کر سکے ورنہ یہ مشاعرے اسی طرح ختم ہوتے رہیں گے۔"

"کمال کے آدمی ہیں آپ۔" بے تاب نظیری نے کہا "آپ

ایک چور شاعر کی حمایت کررہے ہیں۔ آپ کو آٹھ دن ہوئے ہیں شاعری شروع کیے ہوئے اور آپ میرے منہ لگ رہے ہیں۔"

"مجھے آٹھ دن ہوئے ہیں مگر آپ کو تو سولہ دن ہو گئے ہیں۔ آپ ایک غزل اور کہہ لیتے' مشاعرہ ختم کیوں کردیا؟"

"دیکھ رہے ہیں آپ لوگ۔ میرے سیکڑوں شاگرد ہیں اور یہ حضرت مجھ سے بحث کررہے ہیں۔"

جمال کے بھی ایک دو نہیں کئی قدردان تھے۔ بعض نے اسے سمجھایا' بعض نے اس کے موقف کی حمایت کی اور بات ختم ہوگئی۔

وہ طرحی مشاعروں کے خاتمے کے لیے کوشاں تھا۔ اس نے نوجوان شعرا کو اپنا ہم خیال بھی بنالیا تھا لیکن جو لوگ ان طرحی مشاعروں کو ادب کی بہت بڑی خدمت سمجھ رہے تھے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں تھے کہ یہ مشاعرے ختم ہوں۔ ان شعرا کا چونکہ اثر بہت تھا اس لیے کوشش کے باوجود بات وہیں کی وہیں تھی۔ استادی شاگردی کا بھرم بھی ان طرحی مشاعروں کی وجہ سے قائم تھا اس لیے بھی استاد شعرا ہماری بھرپور مخالفت کررہے تھے۔

ہماری کوششوں سے طرحی مشاعرے تو ختم نہیں ہوئے بلکہ الٹا یہ ہوگیا تھا کہ فیض امروہوی پر پابندی لگ گئی تھی۔ اس کی تو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔

"دیکھیے صاحب' رات مشاعرہ ہوگیا۔ ہمیں کسی نے بلایا ہی نہیں۔ ہم تمام رات سامعین میں بیٹھے رہے۔ کسی نے ہمارا نام ہی نہیں پکارا۔"

"ہم نے بے تاب نظیری صاحب کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگ لی مگر وہ معاف ہی نہیں کرتے۔"

وہ روز آتا' رو رو کر احوال سناتا اور چلا جاتا۔ ہماری وجہ ہی سے اس پر یہ عتاب ٹوٹا تھا لہٰذا جمال کو رحم آگیا اور یہ طے کیا گیا کہ اسے معافی دلوائی جائے۔

ایک مشاعرے میں ہم اسے اپنے ساتھ لے کر پہنچے اور مشاعرے میں پہنچ کر ہم نے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ سامعین کی طرف پیٹھ اور دیوار کی طرف منہ کرکے پڑھ سکتا ہے تو اسے معافی مل جائے گی۔ تمام شعرا نے اس انداز میں معافی کو پسند کیا اور کمال یہ ہے کہ خود فیض صاحب نے اس تجویز پر خوش ہوتے ہوئے عمل کیا اور انہیں معافی مل گئی۔ اس دن کے بعد سے فیض صاحب ہمیشہ جمال کے احسان مند رہے۔

جمال کی دوستیاں پھیلتے پھیلتے دوسری مضافاتی بستیوں تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ ملیر' سعود آباد' ڈرگ روڈ (شاہ فیصل کالونی) کے جو شعرا کورنگی' لانڈھی کے مشاعروں میں آتے' ممکن نہیں تھا کہ جمال کی محبت میں گرفتار ہوئے بغیر چلے جاتے۔ ثروت حسین' شوکت عابد' سطوت میرٹھی' مقبول نقش' سعید وارثی' قمر جمالی' رضا اللہ آبادی' آرزو اکبر آبادی۔ ان بستیوں کے کتنے ہی بڑے چھوٹے نام تھے جو جمال کے عاشقوں میں تھے۔ اس کی وجہ سے اپنی اپنی بستیوں سے کورنگی کا رخ کرتے تھے اور پھر اس بُلبلِ کورنگی کو' اپنے اپنے گلزاروں میں بلاتے تھے۔ جمال مجھے بھی اپنے ساتھ لگائے پھرتا تھا۔

مجھے کبھی نہیں لگا کہ وہ ان مشاعروں میں محض غزل پڑھنے جاتا ہے۔ وہ تو نئی فضا' نئے ماحول' نئے دوستوں کا شائق تھا۔ اس کی یہی طلب اسے بستی بستی لیے گھومتی تھی۔

وہ ان بستیوں کے مشاعروں میں جوگی کا سا پھیرا لگاتا ضرور تھا لیکن شعرا کے ہجوم میں کچھ ہی دیر مسکراتا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھو تو دوستوں کے ساتھ دور کھڑا قہقہے لگا رہا ہوتا۔ کسی منظورِ نظر کو راہ پر لگاتا اور مشاعرے سے غائب۔ مشاعرہ ختم ہوتا تو وہ گھر لوٹنے کے بجائے وہیں کسی عارضی پڑاؤ پر قیام کرتا۔ کہتے ہیں اپنے گھر میں اور اپنے بستر پر نیند اچھی آتی ہے لیکن وہ ایسا شب بیدار تھا جو نئی سے نئی جگہ پر بڑے اعتماد سے سوجاتا تھا۔ شاید وہ گھر اور بستر ساتھ لیے پھرتا تھا۔

سنگ کو تکیہ بنا خاک کو چادر کرکے
جس جگہ تھکتا ہوں پڑ رہتا ہوں بستر کرکے

وہ اپنے گھر کی طرح ان بستیوں سے بھی جلد ہی اکتا گیا۔ ان علاقوں کی فضا بھی وہی تھی جس میں وہ پروان چڑھا تھا اور جس کا عرفان اسے ہوگیا تھا۔ اسے عرفان ہوگیا تھا کہ یہ آسمان اس کی پرواز کے لیے بہت کم ہے۔

ایک دن اس نے بڑے پتے کی بات کہی "یار' جہاں سب سے اچھے شاعر ہم ہی ہوں وہاں جانے سے کیا فائدہ۔ ہم کیا سیکھ سکتے ہیں۔"

پھر ایک دن وہ دشت اور نگر ملانے کے لیے مجھے ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنقیدی نشستیں ہوتی تھیں۔ وہ مجھے ایک ایسی ہی نشست میں لے کر آگیا۔ رفیق چودھری' ڈاکٹر حسّان اور ڈاکٹر حنیف فوق وغیرہ سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا مطلب تھا' وہ یہاں پہلے بھی آچکا ہے۔

کسی کوٹھی کے لان میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر چند لوگ بیٹھے تھے۔ کسی نے غزل پڑھی اور پھر گفتگو کا آغاز ہوا۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ میری تربیت مشاعروں میں ہوئی تھی' میں بھلا ان نشستوں میں کب بول سکتا تھا۔ چند خیال ذہن میں آئے بھی تو اسی وقت آپس میں الجھ گئے۔ ایسی حالت میں رہنے ہی نہ پائے کہ ان کا اظہار ہوتا۔ جمال بار بار مجھے اکسا رہا تھا کہ میں بولوں لیکن مجھے تو پسینے آرہے تھے۔ اس پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ مجھے کہاں لے آیا تھا۔ تربیت جمال کی بھی مشاعروں ہی میں ہوئی تھی لیکن وہ منہ پھٹ بھی تھا اور اس میں خود اعتمادی بھی بہت تھی۔ اس نے میری لاج رکھ لی۔ کسی کا کوئی نکتہ اچک لیا اور دیر تک بولتا رہا۔ اس کا یہ وصف تھا کہ اگر اس کے پاس علمی دلائل نہ بھی ہوتے تو بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ عقلی دلائل سے حریف کو زیر کرلیتا تھا۔

نشست ختم ہوئی تو اس نے اگلی نشست کے لیے میری غزل

رکھوادی۔ اس کی مجھے فکر نہیں تھی۔ غزل پڑھنے میں کیا مضائقہ تھا۔ تنقید ہوتی ہے تو ہو۔

یہاں سے نکل کر وہ مجھے اپنی بہن کے گھر لے گیا۔ اس کے بہنوئی کو میں نے بی۔ اے کے امتحان کے لیے تیاری کرائی تھی اس لیے ان سے میرا تعارف اس رشتے سے بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر جمال نے اس نشست کا احوال اور اپنی تقریر مزے لے لے کر بیان کی اور دیر تک وہاں کی باتیں خوش ہو ہو کر اس طرح بتاتا رہا جیسے کوئی دیہاتی بچہ پہلی مرتبہ میلہ دیکھ کر آیا ہو۔

اگلی نشست میں تنقید کے لیے میں نے غزل پیش کی۔ ان نشستوں میں جس طرح گفتگو ہوتی ہے' ہوئی لیکن یہ ہوا کہ ہم یہاں باقاعدگی سے آنے لگے۔

ان نشستوں کا فائدہ یہ ہوا کہ جمال کو اپنی کم علمی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اسے ایسے لوگوں کی تلاش ہونے لگی جو نرے شاعر نہ ہوں' شاعری پر بات بھی کر سکتے ہوں۔

ایک دن ایسی ہی کسی نشست میں احمد جاوید اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے اس پر بھی محبت کا جال پھینکا اور گرفتار کر کے کورنگی کے ایک مشاعرے میں لے آیا۔

بڑی موری کا پاجامہ' سفید کرتہ پہنے' گندمی رنگ' گول مٹول سا ایک لڑکا' ترچھی مانگ نکالے' جمال کے برابر بیٹھا تھا۔ جمال نے میرا تعارف بھی کرایا۔ میں بھی وہیں جم گیا۔

نوجوانی میں موت کی خواہش
تم ہی سمجھا سکو تو سمجھاؤ

مجھے مجاز سے لے کر مصطفےٰ زیدی تک کئی شعرا کا لڑکپن یاد آگیا۔ اس شعر نے ایسا اثر کیا کہ احمد جاوید دل میں اتر گیا۔ پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی شفیق بزرگ بچوں کو کہانی سناتا ہے۔

مشاعرے کے بعد یہی ہوتا تھا کہ تین آدمیوں کا قافلہ جمال کے گھر کی جانب پیدل روانہ ہوا۔ ان میں ایک احمد جاوید تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس عمر میں کسی کے پاس اتنا علم بھی ہو سکتا ہے۔ کلاسیکی شعرا کی بات آئی تو اس نے غزلیں کی غزلیں زبانی پڑھ ڈالیں۔ فارسی شعرا کا تذکرہ چھڑ گیا تو وضاحت کے لیے فارسی شعروں کے حوالے دیتا چلا گیا۔ ہماری سہولت کے لیے ترجمہ بھی کرتا جا رہا تھا۔ ورڈزورتھ' شیلے اور کیٹس پر بے تکان گفتگو کر رہا تھا۔ فقرے بازی میں بے شک ہم اس سے آگے تھے۔

اس رات کی صبح ہوئی تو ہم اجمیری ہوٹل پر بیٹھے تھے۔ بات فلموں کی نکل آئی تو اس نے خاموش فلموں سے لے کر اب تک کی تاریخ دہرادی اور ایسے نہیں' حوالوں اور مثالوں کے ساتھ۔ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا کہ یہ لڑکا چیز کیا ہے۔ دوپہر کو جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے جمال سے' واپسی کے کرائے کے لیے پیسے مانگے۔ چھپ چھپا کر نہیں' سب کے سامنے' دھڑلے سے۔ جمال نے جب پیسے اسے دے دیے تو اس نے اپنا فلسفہ بھی سنا دیا۔

"جو دوست اُدھار نہیں دے سکتا' میں اسے دوست تسلیم نہیں کرتا۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جمال کو دوست تسلیم کر کے بس میں سوار ہو گیا۔ اس دوستی کو وہ نبھاتا رہا۔ اس کا فلسفہ سچا تھا۔ جمال کے سوا اس نے ہم میں سے کسی سے قرض نہیں مانگا لیکن دوست کے دوست بھی تو دوست ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں بھی دوست ہی کہتا اور مانتا رہا۔

کنگ ہال' صدر میں مشاعرہ تھا۔ یہ کُل پاکستان مشاعرہ تھا اور داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ تنقیدی نشست والے رفیق چودھری اس کے مہتمم تھے۔ جمال کی ان سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ ان کے ذریعے میں اور جمال بھی مشاعرے کی انتظامی کمیٹی کے رُکن بن گئے۔ ہم دونوں کی ڈیوٹی گیٹ پر ٹکٹ چیک کرنے کے لیے لگا دی گئی۔ مجھے اس قسم کی خدمات کبھی اچھی نہیں لگیں۔ مجھ سے زیادہ یہ کام جمال کی فطرت کے منافی تھا لیکن وہ بڑی دل جمعی سے کرسیاں تک بچھوا رہا تھا۔ وہ آدمی جو اپنے گھر میں گھڑے سے پانی نکالنے اور گلاس میں انڈیلنے تک کے لیے اپنے چھوٹے بھائی مصطفےٰ کو آواز دیتا تھا' گیٹ پر کھڑے ہو کر ٹکٹ دیکھ رہا تھا' شاعروں کا استقبال کر رہا تھا۔

"یار' ہم بھی تو شاعر ہیں۔ کورنگی میں دیکھو ہماری کیا شان ہے۔ تم نے یہاں لا کر پھنسا دیا۔" میں نے دبے لفظوں میں کہا۔

"میری چودھری صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ وہ ہم دونوں کو اس مشاعرے میں پڑھوائیں گے بھی۔"

"وہ تو ٹھیک لیکن یہ کام....."

افسوس معنی نگار جمال احسانی روانہ شد

۱۴۱۸ھ

چہرہ اُترا اس بنا اب شوخیِ گفتار کا
تھا جمال احسانی آئینہ نما کردار کا
یہ بھی سچ ہے بزم خوابیدہ ہوئی اس کے بغیر
وہ بھی رندِ باوفا تھا محفلِ بیدار کا
اس کے جانے سے نہ جانے کتنی آنکھیں نم ہوئیں
دل کو دریا دے گیا منہ موڑ کے آزار کا
اس کو نم دیدہ نظر نے سرخروخوش گو کہا

۱۹۹۸ء

عمر بھر مختار جو' جویا رہا اشعار کا
(مختار اجمیری)

○☆○

"یار، جگہ بنانے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کل پاکستان مشاعرے میں چانس مل رہا ہے کوئی مذاق نہیں ہے۔"

اس مشاعرے میں جمال نے بھی پڑھا اور میں نے بھی۔ مشاعرہ پڑھ کر جب ہم کورنگی جانے کے لیے بس میں بیٹھے تو ہمارا دل ہمارے بس میں نہیں تھا۔

"ہماری عمروں کا کوئی اور شاعر تھا وہاں؟" اس نے کہا "اور کورنگی کے کسی شاعر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھنا ایک زمانہ وہ آئے گا جب کوئی کل پاکستان مشاعرہ ہمارے بغیر نہیں ہوا کرے گا۔"

○☆○

احمد جاوید اب جمال کے گھر اکثر آنے لگا تھا۔ وہ جب آتا مطالعے کی عادت ڈال کر چلا جاتا۔ میں 'یاد صدیقی' الیاس شاداں اور جمال گھنٹوں ادبی بحثیں کرتے' کتابیں پڑھتے۔ کورنگی کے ماحول میں یہ باتیں بڑی عجیب سی تھیں۔ یہاں تو جب دو شاعر مل جاتے' کسی مشاعرے کے دعوت ناموں کا تبادلہ ہوتا یا غزلیں سنائی جاتیں۔ ہم اجمیری ہوٹل پر بیٹھ کر جب جدید حسیت پر گفتگو کرتے تو اکثر شاعر تو ویسے ہی کترا کر گزر جاتے۔

جمال نے ایک غضب یہ کیا کہ کورنگی میں تنقیدی نشست کی بنیاد رکھ دی۔ ہر ہفتے کم از کم دو شاعر تخلیقات تنقید کے لیے پیش کرتے تھے جس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔

یہ نشستیں دلچسپ اور معلومات افزا تو تھیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ جمال کی فطرت سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ علمی آدمی نہیں تھا' اوّل و آخر شاعر تھا۔ چند ہفتوں کی بک بک جھک جھک کے بعد اس کا دل بھر گیا۔ اس نے دلچسپی نہیں لی تو دوسرے شعرا بھی بکھر گئے اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

طرحی مشاعروں کی مخالفت' تنقیدی اجلاس' ادبی گفتگو اور خود اس کی نئی اور جاندار شاعری۔ ان سب چیزوں نے مل کر کورنگی کی ادبی فضا کو کئی خوش گوار تبدیلیوں سے آشنا کیا۔ ان تبدیلیوں میں جمال کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی کوششوں سے ماحول یہ بن گیا کہ طرحی مشاعروں کے ساتھ ساتھ غیر طرحی مشاعرے بھی ہونے لگے۔ جس قسم کی روایتی اور رسمی شاعری ہو رہی تھی' اس میں بھی تبدیلی آئی۔ نوجوان شاعروں کا ایک حلقہ اس کے ساتھ رہنے لگا تھا یا اس سے متاثر تھا۔ ان شاعروں نے اس کی شاعری سے اثر قبول کیا یا کم از کم اتنا ہوا کہ قدیم طرز کی شاعری پر سے اعتقاد اٹھنے لگا۔

یہ سب تو تھا لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی دُھن میں مگن شاعری کیے جا رہا تھا۔ جب اس سے ملو' سنانے کے لیے دو چار شعر ہمیشہ اس کے پاس رہتے تھے۔

احمد جاوید کا جادو بھی چند مہینوں میں اتر گیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ تخلیقی آدمی' نقاد سے بڑا ہوتا ہے۔ اگر میں کتابوں میں ڈوب گیا تو شاعری میں کون ابھرے گا۔ دراصل اس کی آوارگیاں اسے کتاب لے کر بیٹھنے نہیں دیتی تھیں۔ شاعری کے علاوہ بھی اسے کچھ کام تھے' کتابوں میں الجھ کر ان کاموں میں ناکام ہونے کا اندیشہ تو بہرحال تھا۔

وہ کہا کرتا تھا' کتابیں نظم و ضبط سکھاتی ہیں۔ آدمی کو بااصول بنا دیتی ہیں اور مجھے بااصول آدمی سخت ناپسند ہیں۔ میں نظام الاوقات کا پابند ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے تو نظم کے مقابلے میں غزل پسند ہی اس لیے ہے کہ یہ بھی میری طرح منتشر بکھری بکھری ہے۔ بس اتنی ہی کتابیں پڑھو جتنی شاعری کرنے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

اس "کتاب دشمنی" کے باوجود اس نے خود پر یہ احسان ضرور کیا کہ میری بات مانی اور بی۔ اے میں رجسٹریشن کرا لیا۔

اس جیسے ذہین آدمی کو کسی معمولی طالب علم کی طرح دن رات پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتابیں دیکھنے کے بعد ہی اس کی ہمت بندھی تھی۔ اب وہ ان کتابوں کو کبھی کبھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

طرحی مشاعروں میں اب وہ بہت کم جاتا تھا۔ اس شرکت میں بھی اس نے عجیب وضع اختیار کی تھی۔ غزل کہتا ضرور تھا۔ مشاعرے میں پڑھتا بھی تھا' داد بھی وصول کرتا تھا لیکن غزل ختم ہوتے ہی شعرا کے سامنے' اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے پھاڑ کر پھینک دیتا تھا جیسے کہہ رہا ہو' دیکھو یہ ہے طرحی غزلوں کی اہمیت۔

○☆○

اب ان مشاعروں میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی تھی لیکن شاہد الوری کی دریا دلی اسے بہائے لیے پھر رہی تھی۔

کورنگی کے مشاعروں میں شاہد الوری کا بڑا اہم کردار تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے گھر پر مشاعرے اور دعوتیں کرتے تھے بلکہ اکثر مشاعروں کے انتظامات انہی کے سپرد ہوتے تھے۔ کورنگی کے وہ مشاعرے جن میں شہر کے شاعر شریک ہوئے' شاہد الوری ہی کے مرہون منت تھے۔ وہ پی آئی اے میں ملازم تھے اس لیے شعرا کو سفری سہولتوں اور مختلف اقسام کے مشروبات کی پیش کشوں نے ان کے مراسم بڑے بڑے شعرا سے پیدا کر دیے تھے۔ وہ ان مراسم کا کچھ حصہ کورنگی کی ادبی رونق بڑھانے کے لیے بھی خرچ کرتے رہتے تھے۔

وہ اپنی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے نوجوان طبقے میں ہمیشہ مقبول رہے۔

جمال کو انہوں نے یا ان کو جمال نے پہلے دوسرے مشاعرے کے بعد ہی اچک لیا تھا۔ جیسے جیسے جمال کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی' جمال ان کے لیے عزیز سے عزیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ جمال کے فقرے' اس کا بے تکلف ہونے کا مخصوص انداز' اس کی شاعری ان کے دل میں اتر گئی۔ اب یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ شاہد الوری کچھ سوچیں اور جمال کو اس کی خبر نہ ہو۔

کچھ دنوں تو جمال اپنی مستی میں مست رہا۔ اس دوستی کو مشاعروں تک نبھاتا رہا' پھر یہ دوستی شاہد بھائی کا پیچھا کرتی ہوئی ان

کے گھر تک پہنچ گئی۔ جب وہ شاہد بھائی کو اپنی محبت میں جکڑ چکا تو ان سے نخرے اٹھوانے لگا اور شاہد بھائی نے نخرے اٹھائے کیونکہ اب وہ یہ کہہ چکے تھے کہ..... جمال میرا دوست کم اور بیٹا زیادہ ہے۔

شاہد بھائی گھر پر ہوں نہ ہوں' ان کا گھر اس کا گھر تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ایک لمبا کمرا تھا جو بنایا ہی اس لیے گیا تھا کہ جب چاہیں اس میں مشاعرہ ہو سکے اور ایک وقت میں کتنے ہی دوست آجائیں' اس میں سما جائیں۔ کراچی سے باہر کا کوئی شاعر آتا تھا تو یہی کمرا اس کا ریسٹ ہاؤس ہوتا تھا۔ جمال جب پہنچتا' یہ کمرا اس کے قبضۂ اقتدار میں ہوتا۔ شاہد بھائی کے بچے اس کی اسی طرح خدمت میں مصروف رہتے جس طرح مصطفےٰ اور ہلال اس کے آگے پیچھے رہتے تھے۔

شاہد بھائی اسے بیٹا کہہ چکے تھے لیکن ایسے والد ثابت ہو رہے تھے جو بے حد لاڈ پیار سے اولاد کو بگاڑ دیتے ہیں۔ سگریٹ سے لے کر قرض ادھار تک' شاہد بھائی ہر وقت تیار رہتے تھے۔ شاہد بھائی' سردیاں آگئی ہیں۔ پائے ہو جائیں۔ اگلے دن پائے پک جاتے۔ صرف وہ نہیں' اس کے سارے دوست مدعو ہوتے۔ اپنا پیکٹ جیب میں رکھ کر شاہد بھائی ایک سگریٹ کے ساتھ ایک گالی ضرور دیتے۔ کیا خبران کی محبت بھری گالیاں سننے کے لیے ہی وہ ان سے سگریٹ مانگتا ہو۔ سگریٹ کی طلب نہ ہوتی ہو' ان سے چھیڑ چھاڑ کی طلب ہوتی ہو۔

وہ مشاعروں سے برگشتہ ہو گیا تھا لیکن شاہد بھائی کی تو کائنات ہی یہ مشاعرے تھے۔ وہ جمال کی ہر بات مانتے تھے' اگر نہیں مانتے تھے تو یہ کہ فلاں مشاعرے میں نہیں جانا ہے۔

"جب اساتذہ تمہیں سنیں گے نہیں تو تسلیم کیسے کریں گے۔" وہ دلیل دیتے۔

"میں انہیں اساتذہ ہی تسلیم نہیں کرتا۔" جمال کہتا۔

"ابے یہ کوئی اساتذہ ہیں لیکن مشہور تو ہو گئے ہیں۔" وہ فوراً ہتھیار ڈال دیتے۔ پھر سرگوشی میں کہتے "سنا ہے دو شاعرات بھی آرہی ہیں۔ ایک شفیق بانو بریلوی ہے' ایک کوئی اور ہے۔"

انہیں معلوم تھا جمال کس طرح جائے گا۔ اس کی کمزور رگوں پر ہاتھ رکھتے اور وہ تیار ہو جاتا۔ کم و بیش ہر مشاعرے میں وہ اسی طرح کی کسی دلیل سے جمال کو قائل کرتے اور "ہائی لائٹ" کے سگریٹ پلاتے ہوئے اسے مشاعرے تک لے آتے۔

اکثر مشاعروں کے ٹھیکے شاہد بھائی کے پاس ہوتے تھے اس لیے جمال کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ شاہد الوری بذاتِ خود اس کا دعوت نامہ تھے۔

"نواب تصور کو جانتے ہو؟" ایک دن انہوں نے پوچھا۔

"شاہد بھائی تم بھی عجیب عجیب نام ڈھونڈ کر لاتے ہو۔" جمال نے کہا۔

"داغ کے رنگ میں شاعری کرتے ہیں۔ اپنے گھر مشاعرے

غزل

سبھی کھڑے تھے شریکِ زمانہ ہوتے ہوئے
کسی نے روکا نہ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے
چراغ بجھتے چلے جارہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے
اچانک ایک ستارہ فلک سے ٹوٹ گیا
مرے بھی شاملِ بزمِ شبانہ ہوتے ہوئے
اسی طرح کے ہیں جتنے بھی دکھ ہمارے ہیں
سروں پر چھاؤں نہیں شامیانہ ہوتے ہوئے
مرا بھی نام ہے فہرستِ مجرماں میں لکھا
میں دیکھتا رہا خالی خزانہ ہوتے ہوئے
مرا کمال کہ میں اس فضا میں زندہ ہوں
دعا نہ ملتے ہوئے اور ہوا نہ ہوتے ہوئے
حریف تھا مرے دشمن کا وہ مگر میں نے
جمالؔ کی نہیں بیعت' بہانہ ہوتے ہوئے

○☆○

بھی کرتے ہیں۔ کل آجانا' ان کے گھر مشاعرہ ہے۔ میں نے تمہارا ذکر کر دیا تھا۔"

"کل تو مشکل ہے شاہد بھائی۔"

"ابے نخرے چھوڑ۔ کورنگی سے نکلو۔ شہر کے مشاعرے پڑھو گے تو کچھ مشہور ہو گے۔"

شاہد بھائی نے بالآخر اسے تیار کر لیا اور مجھ سے بھی کہہ دیا۔ مشاعرے کی رات طعام' قیام اور سفر خرچ وغیرہ شاہد بھائی کے ذمے ہوتا تھا لہٰذا ہم سرشام ہی پہنچ گئے۔

"معافیہ! جمال آگیا ہے۔" شاہد بھائی نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ پھر جمال سے مخاطب ہوئے "الو کے پٹھے' سلام کر کے آؤ اور چائے کا بھی کہتے آنا۔"

میں بیٹھا رہا اور جمال پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ خاصی دیر ہو گئی نہ جمال آیا نہ اس کی آواز آئی۔

"یہ مرگیا یا دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔" شاہد بھائی نے کہا اور اسے دیکھنے کے لیے اندر چلے گئے لیکن فوراً ہی پلٹ آئے "دیکھ' اس شاعر کی اولاد کو۔"

"کیا ہوا شاہد بھائی۔"

"تو خود دیکھ لے آکر۔"

میں نے اٹھ کر دیکھا۔ کمرے کے سامنے باورچی خانہ تھا۔

جمال ایک چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا اور شاہد بھائی کی بیوی توے پر روٹی ڈال رہی تھیں۔

"موصوف کل ہی فرمائش کر گئے تھے کہ اوجڑی پکانا اور اب بیٹھے کھا رہے ہیں۔ ہم بیٹھے جھک مار رہے ہیں۔"

جمال کو تاکا جھانکی کا احساس ہوا تو اس نے بے پناہ مصروفیت کے باوجود گردن اٹھائی۔ روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں' چند بوٹیاں منہ میں کچھ ہاتھ میں اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جا' بھائی۔ آرام سے کھا۔"

"شاہد بھائی' باورچی خانے کے قریب بیٹھ کر کھانے کا لطف ہی اور ہے۔ کوئی چیز کم ہو جائے تو فوراً دستیاب ہو سکتی ہے۔" پھر شاہد بھائی کی بیوی سے مخاطب ہوا "بھابی' ذرا شوربا تو نکالنا" اس نے پلیٹ ان کے آگے کر دی۔

پلیٹ سے منہ لگا کر شوربا پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بوٹی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی جو اس نے ڈرائنگ روم تک آتے آتے دہن خوش خوراک کے سپرد کر دی۔

"ہمارے لیے بھی کچھ چھوڑا یا کھا گئے سب۔" شاہد بھائی نے کہا۔

"قسم خدا کی دو بوٹیاں کھائی ہیں' بکتے بکتے۔ ابھی کھانا کہاں کھایا ہے۔"

وہ کھانے کے معاملے میں چٹوری عورتوں کی طرح تھا جو چکھنے کے نام پر آدھی ہانڈی پیٹ میں اتار لیتی ہیں۔

کھانا تیار ہو گیا تھا اس لیے چائے مؤخر کر دی گئی۔ ہم نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جمال پھر شریک ہو گیا تھا۔

"شاہد بھائی' کیا چیز ہے یہ اوجڑی بھی۔ زندگی بن گئی آج۔ کمال کا پکائی ہیں معانیہ بھابی۔ کسی دن بٹیں پکواؤ شاہد بھائی۔"

"ابے یہ تو ہضم کر' وہ بھی پک جائے گی۔"

اس نے ہاتھ پونچھے اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کھڑا رہنا گناہ سمجھتا تھا۔ فوراً لیٹ جاتا تھا اور الٹ پلٹ کر کھانا ہضم کر لیتا تھا۔

شاہد بھائی نے سوٹ زیب تن کیا' بریف کیس اٹھایا اور مشاعرے کے لیے گویا تیار ہو گئے۔ مجبوراً جمال کو بھی اٹھنا پڑا۔ میں تو تیار ہی بیٹھا تھا۔

"آپ ٹیکسی کے بغیر تو جائیں گے نہیں۔" شاہد بھائی نے باہر نکل کر جمال سے کہا۔

"مشاعرے میں جا رہے ہیں' وہ بھی نواب تصور کے گھر اور پھر آپ ساتھ ہیں۔ بس میں جاتے کیا اچھے لگیں گے۔" جمال نے کہا۔

"چل بھائی' ٹیکسی میں چل مگر چل۔"

نواب تصور حیدر آباد کالونی میں رہتے تھے۔ کورنگی سے جیل روڈ تک کا فاصلہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ شاہد بھائی ایسے ہی شاہ خرچ تھے۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"شاہد بھائی' اس سے کہو آہستہ چلائے۔"

جب شاہد بھائی نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو وہ ڈرائیور سے براہِ راست مخاطب ہوا "خان صاحب' جلدی نہیں ہے۔ آہستہ چلائیں۔"

وہ اپنی رفتار پر چلاتا رہا۔ جمال انتظار کر رہا تھا کہ شاید اس کی بات کا کوئی اثر ہو گا۔ اس سے پھر صبر نہیں ہو سکا۔

"خان صاحب' تم سنتے کیوں نہیں ہو۔ کیا مارو گے کیں۔"

"روڈ خالی پڑا ہے۔ کیوں چینتا ہے تم۔"

"خان صاحب' لڑکا دل کا کمزور ہے۔ ذرا آہستہ کر لو۔" شاہد بھائی نے سفارش کی۔

ڈرائیور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور اسپیڈ کم کر دی۔ جمال نے دھیان بٹانے کے لیے سگریٹ سلگائی اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ خود بہت تیز رفتار تھا لیکن تیز رفتار سواری میں بیٹھنا اس کے لیے سوہان روح ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ٹیکسی یا کار میں سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ آہستہ چلاؤ' اوور ٹیک مت کرو' دیکھ کر آگے اسکوٹر ہے۔ شور ہی مچاتا رہتا تھا۔ میں اس سے اکثر کہتا تھا' تم موت سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ وہ جواب دیتا تھا' موت سے نہیں ڈرتا لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آدمی روڈ پر مرے۔

ہم ٹیکسی سے اترے تو نواب صاحب دروازے پر کھڑے شعرا کا استقبال کر رہے تھے۔ بھاری بدن' سر کے بال سفید اور اتنا ہی سفید رنگ۔ نہایت شاندار شخصیت تھی۔ واقعی نواب لگتے تھے۔

"شاہد صاحب' آپ ہی کا انتظار تھا۔ نظامت تو آپ ہی فرمائیں گے۔" نواب صاحب نے کہا اور ہمیں لے کر اندر پہنچ گئے۔

کوئی نامور شاعر تو وہاں موجود نہیں تھا البتہ سید ہاشم رضا بطورِ صدر موجود تھے۔ ہم انہیں پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔ شاہد بھائی کے کہنے کے مطابق تین شاعرات بھی موجود تھیں۔ ہم ان میں سے کسی سے بھی واقف نہیں تھے۔

"یار یہ تو وہی کورنگی کا مشاعرہ ہو گیا۔" جمال نے کہا "ڈھنگ کا کوئی شاعر بھی نہیں ہے۔ پورا لالو کھیت بھرا ہوا ہے۔ عورتیں بھی بس یونہی سی ہیں۔ ایک البتہ قاعدے کی ہے۔"

میں نے اس شاعرہ کی طرف دیکھا۔ قاعدے کی کیا' اسے خوب صورت کہا جا سکتا تھا۔ گورا رنگ' نہایت حسین آنکھیں کسی بات پر ہنسی تو جی چاہا میں بھی ہنسنے لگوں۔ بہت خوب صورت ہنسی تھی۔

"یار' جان پہچان نہیں ہے ورنہ گپ شپ ہی رہتی۔" جمال

نے کہا۔

"شاہد بھائی تو جانتے ہوں گے۔"

"ابھی موقع نہیں ہے ورنہ شاہد بھائی ہمارا تعارف کرا دیتے۔"

"انہیں تو مشاعرے کی فہرست سے فرصت نہیں ہے۔"

"سالے، غزل ایسی دھانسو پڑھنا کہ تعارف خود بخود ہو جائے۔"

"کون سی پڑھوں؟"

اس نے مجھے غزل بتائی، میں نے اسے مشورہ دیا اور اس رخ سے بیٹھ گئے کہ وہ شاعرہ ہمیں نظر آتی رہے۔

کورنگی کے مشاعروں میں شاعرات شرکت نہیں کرتی تھیں، اس لیے یہ ہمارے نزدیک متاثر کن صورتِ حال تھی اور ہماری عمروں کے اعتبار سے سنسنی خیز بھی۔

جمال کا نام پکارا گیا۔ وہ اسی اعتماد کے ساتھ اٹھا جو اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔ ظالم نے نہ جانے کب کی کہی ہوئی کمال غزل نکالی۔

کبھی بھلا کے کبھی اس کو یاد کرکے مجھے
جمالؔ قرض چکانے ہیں عمر بھر کے مجھے
ابھی تو منزلِ جاناں سے کوسوں دور ہوں میں
ابھی تو راستے ہیں یاد اپنے گھر کے مجھے
جو لکھتا پھرتا ہے دیوار و در پہ نام مرا
بکھیر دے نہ کہیں حرف حرف کرکے مجھے
محبتوں کی بلندی پہ ہے یقیں تو کوئی
گلے لگائے مری سطح پر اتر کے مجھے
چراغ بن کے جلا جس کے واسطے اِک عمر
چلا گیا وہ ہوا کے سپرد کرکے مجھے

یہ شائستہ لب ولہجہ، عشقیہ جذبات کا ایسا سنبھلا ہوا انداز، اور پھر اس کی کم عمری۔ ان سب نے مل جل کر محفل کو گرما دیا۔ ایک ایک شعر کو کئی کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد وہ اپنی جگہ پر واپس آیا تو ہر آنکھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان دیکھنے والوں میں وہ دو آنکھیں بھی شامل تھیں جن سے ابھی اس کا تعارف نہیں ہوا تھا۔

تقریباً بارہ بجے ہوں گے کہ چائے کے لیے وقفہ کیا گیا۔ سعیدہ ناز ایک شاعرہ تھیں۔ انہوں نے اشارے سے جمال کو اپنے پاس بلایا۔ وہیں وہ شاعرہ بھی بیٹھی تھی جس کی آنکھیں اب بہت دیر سے ہماری نگرانی کر رہی تھیں۔ وہ ہمارے پاس سے اٹھا اور تین عورتوں میں چوتھا مرد بن کر بیٹھ گیا۔

اب میں مطمئن تھا۔ کوئی مسئلہ جب اس کی گفتگو پر آکر رک جائے تو جیت اسی کی ہوتی تھی۔ وہ باتیں کیا کرتا تھا، پھول کھلاتا تھا، چراغ جلاتا تھا۔ لفظوں کی پچکاری سے ہولی کھیلتا تھا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دام بچھائے اور پرندہ پر نہ سمیٹے۔

وہی ہوا جس بات کا یقین تھا۔ واپس آیا تو اس شاعرہ کے بارے میں جتنی معلومات ہو سکتی تھیں جیب میں ڈال کر لے آیا۔ اس کے بعد جتنی دیر مشاعرہ چلتا رہا، اس کی زبان اس شاعرہ کے تعاقب میں چلتی رہی۔

مشاعرہ تو ڈیڑھ بجے رات تک ختم ہو گیا لیکن ہاشم رضا کی تقریر نے مزید آدھا گھنٹا گزار دیا۔

"آؤ۔" جمال نے میرے کان میں کہا۔

"کہاں؟"

"آؤ تو۔" اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا باہر آگیا۔

رات کے دو بج رہے تھے لیکن ابھی تک پان کی ایک دکان کھلی ہوئی تھی۔ دو رکشے کھڑے تھے جن کی پچھلی سیٹوں پر رکشا والے آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ ایک ٹیکسی کھڑی تھی جس کا ڈرائیور غائب تھا۔

"کیا ہوا، باہر کیوں آگئے۔" میں نے جمال سے پوچھا۔

"سگریٹ ختم ہو گئے تھے اور پھر اب اٹھنا تو تھا۔" اس نے کہا اور چلتا ہوا سگریٹ کی دکان تک آگیا۔

اس نے سگریٹ خریدے، ایک سگریٹ جلایا اور انتظار کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

اتنی دیر میں وہ شاعرہ اپنے شوہر کے ساتھ نواب تصور کے گھر سے نکلی اور غالباً رکشا کے لیے چلتی ہوئی وہاں آگئی جہاں میں اور جمال کھڑے تھے۔

"جمال صاحب، آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔" اس شاعرہ نے کہا۔

"کوئی ٹیکسی کورنگی جانے کو تیار نہیں ہے۔"

"بڑی دور رہتے ہیں آپ۔"

"ایسا کرو یار، تم ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلو۔ ذرا باتیں بھی رہیں گی۔" اس شاعرہ کے شوہر نے کہا۔

"کچھ اچھا نہیں لگتا۔" جمال نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا کیا نہیں لگتا۔ میں ٹیکسی دیکھتا ہوں۔ بس اب تم ہمارے ساتھ چلو گے۔"

اس شاعرہ کا شوہر ٹیکسی دیکھنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ہم تو شاہد بھائی کے ساتھ آئے تھے، پھر جمال نے یہ کیوں کہا کہ کورنگی کے لیے ٹیکسی نہیں مل رہی ہے۔

"یار، تم ان کے ساتھ جا رہے ہو، شاہد بھائی کیا سوچیں گے۔" میں نے چپکے چپکے جمال سے کہا۔

"سوچنے دے یار۔ ہمیں اپنی سوچنی ہے۔"

"بری بات ہے جمال۔ وہ ہمیں لائے تھے اور اب ہم انہیں اکیلا

چھوڑ دیں۔"

"یار، ایسی فضول باتیں مت سوچا کر۔ منالوں گا انہیں۔ کسی کی خاطر اپنا راستہ کھوٹا کرنے والے ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔"

ٹیکسی مل گئی تھی، اس لیے مجھے بات ادھوری چھوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ اب میں اس سے نہیں کہہ سکتا تھا لیکن سوچ ضرور رہا تھا کہ شاہد بھائی کے ساتھ ہوئی بُری۔ کتنی خود غرضی کی بات ہے۔ شاہد بھائی ہمیں کتنی محبت سے لے کر آئے تھے، ہم نے انہیں کتنی بے دردی سے کاٹ دیا۔ کم از کم انہیں بتا ہی دیتے۔ وہ ہمیں دیکھنے باہر نکلے ہوں گے تو کتنے پریشان ہوئے ہوں گے۔

میں تو یہ سوچ رہا تھا اور جمال عین اسی وقت کوئی لطیفہ سنا رہا تھا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کے ساتھ کیا کر آیا ہے۔ وہ لمحۂ موجود میں زندہ رہنے والا آدمی تھا۔ ماضی اسے یاد بہت آتا تھا لیکن کسی خالی اور بے کار وقت میں۔ رہا مستقبل، تو وہی تو اس کا لمحۂ موجود تھا۔ وہ ہر قدم مستقبل کی طرف اٹھاتا تھا۔ اندھا دھند نہیں، بہت سوچ سمجھ کر۔ وہ بہت مشاق منصوبہ ساز تھا۔ یہ الگ بات کہ کبھی قسمت ہی ساتھ چھوڑ دے۔ وہ جلد باز نہیں تھا۔ اچھا جواری کبھی جلد باز نہیں ہوتا۔ وہ وقت کے ساتھ چال بدل جاتا تھا۔ اس لیے لگتا تھا کہ جلد باز ہے۔ ابھی ایک کے ساتھ چل رہا ہے، ابھی دوسرے کے ساتھ ہولیا۔ ابھی شاہد الوری کو غالبِ وقت قرار دے رہا تھا، ابھی اس شاعرہ کو میرا بائی سمجھ کر اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ شاعرہ کرائے کے ایک کمرے اور چھوٹے صحن کے ایک ٹکڑے کی مالکہ تھی۔ کمرے میں بچھے واحد پلنگ پر ہم چاروں، ایک ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ پلنگ ہماری فقرے بازیوں کا بوجھ زیادہ دیر نہیں اٹھا سکا۔ کوئی پٹی جواب دے گئی اور ہم چاروں کو ایک جھٹکے سے زمین پر رکھ دیا۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا فقرہ تھا لہٰذا جو ہنسی باقی رہ گئی تھی، وہ اب خرچ ہوگئی۔

جمال کو موقع مل گیا۔ اس نے گدا اٹھایا اور ایک کونے میں بچھا کر خود آنکھ کا ہندسہ بن کر لیٹ گیا۔ بعض اوقات وہ جاگنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر ایسا بے وقت سوتا تھا کہ جھنجوڑنے کو جی چاہے۔

بندۂ خدا جب چوری کرنے آیا تھا تو چوکی دار کے ہتھے کیوں چڑھ گیا۔ سر کا تکیہ ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر وہ کب کا سو چکا تھا۔

ہم نے بھی زمین پر چادریں بچھائیں اور کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

کمرے میں دھوپ آئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ جمال اپنے گدے پر نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہ شاعرہ بھی نہیں تھی، اس کا شوہر بے خبر سو رہا تھا۔ میں صحن میں آیا اور وہ مجھے نظر آگیا۔ وہ اس شاعرہ کے ساتھ باورچی خانے میں کھڑا ناشتا بنا رہا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو وہ شاعرہ میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی لیکن جمال کو اب یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا، کیوں جا رہا ہے، آئندہ آئے گا بھی یا نہیں۔ راستے بھر اس شاعرہ کا نام بھی اس کی زبان پر نہیں آیا۔

میں سمجھ رہا تھا، وہ اب کئی دن تک شاہد بھائی کا سامنا نہیں کر سکے گا لیکن اسی دن، شام کو میں اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا وہ تو شاہد بھائی کے گھر گیا ہوا ہے۔ میں بھی ہمت کر کے پہنچ گیا۔

"آ بھئی، ساجد رام پوری۔ تو بھی آجا، بیٹھ۔" شاہد بھائی کی بے لوث آواز نے میرے سب اندیشے ہوا بُرد کر دیے۔

دونوں کے سامنے ایک پلیٹ رکھی تھی جس میں دو چمچ رکھے ہوئے تھے۔ اس پلیٹ میں جو کچھ بھی تھا، وہ دونوں کھا چکے تھے۔

"ٹھہر جا، تیری قسمت کا بھی دیکھتا ہوں کچھ۔" شاہد بھائی نے وہیں سے اپنی بیوی کو آواز دی اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

"شاہد بھائی تو بہت ناراض ہو رہے ہوں گے؟" میں نے سرگوشی میں جمال سے پوچھا۔

"میری ایک مار کے ہیں۔ آتے ہی پٹا لیا۔ ٹھیک ہو گئے سالے لیکن ایک مصیبت ہے۔ پھر ایک مشاعرہ کہیں سے لے آئے ہیں اور اصرار ہے کہ چلو۔"

"تو چلے جاؤ۔"

"جانا تو پڑے گا۔ اسی لالچ میں تو قصور معاف کیا ہے۔ ویسے رات جو داد مجھے ملی ہے اس سے بہت خوش ہیں۔"

شاہد بھائی کا مسئلہ یہ تھا کہ مشاعرے میں جس شاعر کو داد مل جاتی تھی، ان کے نزدیک وہی بڑا شاعر تھا۔ انہیں اب یقین آگیا تھا کہ جمال بڑا شاعر ہے۔ ان کے ساتھ مشاعرے میں جائے گا تو ان کی بھی پذیرائی ہوگی۔

شاہد بھائی ایک پلیٹ میں کباب ڈال کر لے آئے "لے بھئی، تیری قسمت کے یہ رہ گئے تھے۔"

"کل تمہیں بھی چلنا ہے۔" شاہد بھائی نے مجھ سے کہا۔

"کہاں شاہد بھائی۔"

"اسمٰعیل مینائی کے گھر مشاعرہ ہے۔ امیر مینائی کے پوتے یا نواسے ہیں۔ بڑے مشفق بزرگ ہیں، ملو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے شاہد بھائی۔"

کباب کھا چکے تو چائے آگئی۔ کچھ دیر نواب تصور کے مشاعرے کی تعریفیں ہوتی رہیں، پھر یوسف جاوید کا تذکرہ آگیا۔

"چلو، یوسف جاوید کی طرف چلتے ہیں۔" شاہد بھائی نے کہا۔

ہمیں کیا اعتراض تھا۔ ڈاکٹر جاوید کے کلینک جانے کے لیے پیدل روانہ ہوئے۔

کلینک کے باہر بڑی کرسیوں پر ایک آدمی بیٹھا تھا جو اپنے حلیے سے پہلوان معلوم ہوتا تھا۔ نہایت چوڑا سینہ، ضرورت سے زیادہ پھیلے ہوئے شانے۔ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے سر کے بال۔ بہت چوڑے شانوں پر رکھا ہوا سر بہت چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ نہایت مضبوط ہاتھ اور چوڑی ہتھیلیاں۔

ڈاکٹر جاوید کسی مریض کو دیکھنے میں مصروف تھے اس لیے وہ شخص اکیلا بیٹھا تھا۔

ہم تو یہ سوچ چکے تھے کہ کوئی مریض ہوگا لیکن جب وہ شاہد بھائی کو دیکھ کر کھڑا ہوا اور ان دونوں کے درمیان علیک سلیک ہوئی تو۔ راز یہ کھلا کہ وہ سلیم کوثر ہے۔

"تم لوگوں کی ملاقات نہیں ہے؟" شاہد بھائی نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہے ہوں "تم غالب کو نہیں جانتے!"

"نہیں تو۔"

"کمال ہے۔ چراغ ہوٹل کے مشاعرے میں اس نے قیامت مچادی تھی۔ سلیم کوثر ہے بھائی۔"

جب اس شخص نے اپنی چوڑی بانہیں پھیلا کر، مجھے اور جمال دونوں کو ایک ساتھ اپنے گداز سینے سے لگایا تو ہمیں وہ سخت کھردرا آدمی موم کا پتلا نظر آنے لگا۔ لب و لہجے کی اجنبیت کے باوجود ہمیں وہ سادہ لوح اور محبت کرنے والا لگا تھا۔

جب تعارف ہوا تو شعروں کا تبادلہ بھی ہوا۔ اس کے شعر پڑھنے کا انداز بہت دن تک ہماری محفلوں میں زیرِ بحث رہا۔ پڑھتے ہوئے کندھے جھٹکتا تھا اور ہوا میں ہاتھ لہراتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے چل رہا ہو۔ ہر وقت سرمستی و سرشاری کی کیفیت میں نمایا رہتا تھا۔

وہ ہر شعر کو اس اعتماد کے ساتھ پڑھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو، اس شعر کے بدلے کوئی کائنات دے تو بھی نہ لوں۔

رات گئے ہم واپس لوٹے تو اس کا یہ شعر ہم سب کے حافظے میں محفوظ تھا۔

یہ سلوٹیں نہیں ہیں جبیں کی اٹھان پر
لمحے نقوش چھوڑ گئے ہیں چٹان پر

ان دنوں جمال پر شکیب جلالی کا بڑا اثر تھا۔ وہ اس کا رنگ شاعری اختیار کرتے ہوئے اپنی کئی غزلیں خراب کر چکا تھا۔ سلیم کوثر کی شاعری میں اسے وہی جھلک نظر آئی تو وہ مچل گیا۔

ان دنوں سلیم کوثر جاوید کلینک کے قریب کرائے کے گھر میں آباد تھا لہٰذا جمال کی وہاں آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی۔ سلیم کوثر سے اس کا ربط ضبط بڑھنے لگا تھا اور جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ سلیم کوثر کے والدین بھی اس کی طرح پانی پت سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے تو وہ اس پر اور بھی جان چھڑکنے لگا تھا۔ کچھ دن تو ایسا بھی رہا کہ اس کے چلنے اور غزل پڑھنے کے انداز میں دیکھنے والوں کو سلیم کوثر نظر آتا رہا۔

○☆○

اسمٰعیل مینائی نہایت وضع دار بزرگ تھے۔ میرے ہم وطن تھے اس لیے مجھے ان میں خاصی دلچسپی تھی۔ چوڑی باڑھ کی رام پوری ٹوپی، چہرے پر شرعی داڑھی، معصوم مسکراہٹ۔

تمام قابلِ ذکر شعرا یہاں موجود تھے۔ ماہر القادری، راغب مراد آبادی، رئیس امروہوی، پروفیسر منظور حسین شور، شاعر لکھنوی اور کئی اہم نام۔ شاہد الوری تو خیر سب کے لیے آشنا تھے لیکن ہم تین اس محفل کے لائق قطعی نہیں تھے یعنی جمال، میں اور یاد صدیقی۔ اس وقت ہم سب کو جانتے تھے، کوئی ہمیں نہیں جانتا تھا۔

مجھے دل ہی دل میں شاہد بھائی پر پیار بھی آرہا تھا اور غصہ بھی کہ کہاں لاکر پھنسا دیا۔ ان بزرگوں میں ہماری دال کیا گلے گی۔

ہم میں سے جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ ہم پہنچے تو اس محفل میں کوئی لسانی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جس محفل میں ماہر القادری ہوتے تھے، اس قسم کی بحثیں اکثر چھڑ جاتی تھیں۔

"ایک لفظ ہے کورچا۔ آج کوئی اس لفظ کے معنی بھی نہیں جانتا ہوگا، استعمال کرنا تو بڑی بات ہے۔" ماہر القادری نے کہا۔

"مولانا، اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ ہم اس لفظ کو استعمال نہ کریں لیکن مفہوم سے واقف تو ہیں۔" میں نے کہا اور شاہد بھائی نے گھبرا کر میری طرف دیکھا کہ میں کیا گستاخی کر رہا ہوں۔

"بتایئے کسے کہتے ہیں کورچا۔" مولانا نے مجھ سے پوچھا۔

"اس رقم کو کہتے ہیں جو بیوی اپنے شوہر سے چھپا چھپا کر جمع کرتی ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے معنی بتائے کہ خدا کرے یہی مفہوم ہو "میری والدہ اکثر کہتی ہیں، تیرا باپ کیا میرے پاس کورچا چھوڑ گیا ہے۔"

مولانا نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا "صاحب زادے، آپ کی والدہ محترمہ کا تعلق ہندوستان کے کس شہر سے ہے۔" مولانا نے پوچھا۔

"رام پور۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو آپ اس لفظ سے واقف ہیں۔"

رام پور کا نام آیا تو اسمٰعیل مینائی بھی متوجہ ہوئے۔ مجھے اپنے

"رات کے جاگے ہوئے" سے انتخاب

بے کار سمجھ کر میں جلا بیٹھا جب اس کو
اِک کام اچانک تری تصویر سے نکلا
وہ جس نے دیکھ لیا ہے اسے نظر بھر کے
پسِ غبار و تہِ آب دیکھ سکتا ہے
میں ابھی پہلے خسارے سے نہیں نکلا ہوں
پھر بھی تیار ہے دل دوسری نادانی پر
یہ بات بری ہے مگر آباد گھروں سے
ہم خانہ خرابوں کی طبیعت نہیں ملتی
تمام خاک نشیں زیرِ خاک ہوں گے مگر
لہو کا رنگ تری آستیں پہ اترے گا

○☆○

پاس بلایا۔ بہت دیر تک میرے والد اور خاندان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جیسے میرا تو تعارف ہو گیا۔

اسی دوران میں راغب مراد آبادی نے اعلان کر دیا کہ اب مشاعرہ شروع کیا جاتا ہے۔ طریقہ یہ رکھا گیا کہ جو جس جگہ بیٹھا ہے' تقدیم و تاخیر سے قطع نظر اسی ترتیب سے پڑھے گا۔

مجھے یہ خوشی بھی تھی کہ ہم اتنے اچھے شعرا کے درمیان بیٹھے ہیں اور یہ خوف بھی کہ ہمارا چراغِ سخن ان آندھیوں کے درمیان جلے گا کیسے۔

راغب مراد آبادی نے اپنی رباعیات سے آغاز کیا۔ مجھے یہ سہولت مل گئی کہ میں ان کے فوراً بعد بیٹھا تھا اور پھر میرا تعارف بھی بھرپور ہو گیا تھا لہٰذا ایک آدھ شعر پر اچھی داد مل گئی۔ اتنے اچھے شعرا ایک جگہ جمع ہوں تو ہر شعر شور طلب نہیں رہتا۔ یہی کچھ ہنوروں کے اس دائرے میں ہو رہا تھا۔

جمال کے ساتھ مسئلہ یہ ہوا کہ وہ پروفیسر منظور حسین شور کے بعد بیٹھا ہوا تھا۔ شور صاحب کی شاندار رباعیوں کے بعد جب اس کا نمبر آیا تو اس کا چراغ ٹمٹما کر بجھ گیا۔ غزل کے انتخاب میں بھی وہ کچھ گڑبڑ کر گیا تھا۔ مطلع پر کچھ گردنیں ہلیں اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ شاید الوری کے لیے یہ صورتِ حال بڑی مایوس کن تھی۔ وہ تو جمال کو بڑا شاعر تسلیم کر چکے تھے اور بڑے شاعر اسے داد نہیں دے رہے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اتنے لوگوں کی خاموشی میں وہ بھی داد نہیں دے سکتے تھے۔

اتنے ستاروں میں وہ چراغ اپنی چمک دکھانے سے محروم رہا تھا لیکن اس کی روشنی کسی ایک گوشے میں بند نہیں تھی۔ مشاعرے کے بعد وہ ان ستاروں میں مل کر ستارہ بن گیا۔ گفتگو کا ذرا موقع ملا تو ایسا گھل مل گیا جیسے وہ ان سب کو مدتوں سے جانتا ہو۔ رخصت ہوتے وقت سب سے ہاتھ ملایا تو اس طرح جیسے کچھ دیر کے لیے وہ اونچے چبوترے پر چڑھ گیا ہو۔ اسمٰعیل میناٹی نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔

یہ وصف اس میں بڑا عجیب تھا کہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتا تھا۔ عہدے اور منصب سے ہٹ کر انسانوں سے انسانی سطح پر ملتا تھا اس لئے برابری سے ملتا تھا۔ کتنے ہی بڑے آدمی سے ملاقات ہو جائے' دوستوں کی طرح بے تکلف ہو جاتا تھا۔ ٹی اینڈ ٹی میں بہت معمولی پوسٹ پر ملازم تھا۔ ٹیلی فون کے تار ڈالتا پھرتا تھا' لائن مین کہلاتا تھا لیکن چیف انجینئر اور انجینئروں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر گھومتا تھا' لنچ ان کے ساتھ کرتا تھا۔ ان سے قرض لیتا تھا اور کبھی واپس نہیں کرتا تھا۔ قرض کی رقم سے کہیں زیادہ ان کی دعوتوں پر خرچ کر دیتا تھا۔

○☆○

ٹھک' ٹھک' ٹھک۔

جب دروازہ کسی نے کئی مرتبہ پیٹ ڈالا تو مجھے اٹھنا پڑ گیا۔ والدہ کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔

"اٹھ کر دیکھ تو بھائی' دروازے پر کون ہے۔" امی نے میرے کمرے میں آکر مجھ سے کہا۔

میں ان کی آواز سے پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ انہوں نے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ پہلے میں آواز دے کر پوچھ لوں کہ کون ہے پھر دروازہ کھولوں۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ مجھے خود تعجب ہو رہا تھا کہ اس وقت کون آ گیا۔ میں نے لائٹ آن کی۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی اس نے مجھے آواز دی۔ اب پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جمال کی آواز تھی۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا ہوا جمال۔ اس وقت۔ خیریت؟"

"تو گھبرا کیوں جاتا ہے اتنی جلدی۔ کیا میں تجھ سے ملنے آ نہیں سکتا۔"

میں نے اسے گھر میں بلا لیا لیکن سوچ رہا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔

"مجھ میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی؟" اس نے میرے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"تجھ جیسے معمولی آدمی میں کیا غیر معمولی بات نظر آ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو نے ٹھیک کہا پیارے۔ میں معمولی سے بھی معمولی آدمی ہوں۔"

"کیا بات کیا ہے جمال۔ تو آج اتنا ٹوٹا ہوا کیوں ہے۔"

"میں آج درد اسعدی کی طرف نکل گیا تھا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا "ری کھیلی اور خوب جیتا۔ تمہیں پتا ہے وہ پیتے ہیں۔ آج میں نے بھی پی لی۔"

"تو کیا ہوا۔ یار یہ چیز تو بنی ہی شاعروں کے لیے ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اماں کو دکھ دینا نہیں چاہتا۔ اسی لیے تیری طرف چلا آیا۔"

"کب تک میری طرف آتے رہو گے۔"

"ابے تو روز کون پی رہا ہے۔"

کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے اور پھر اس کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بھی چادر تان لی۔

اس کی عادت تھی کہ رات کو کتنی ہی دیر میں سوئے علی الصباح اٹھ بیٹھتا تھا۔ وہ رات دیر سے سویا تھا لیکن صبح اسی نے مجھے اٹھایا۔ ہم نے ایک ساتھ ناشتا کیا اور اپنے اپنے دفتروں کے لیے گھر سے نکل گئے۔

میرے امتحان ہو رہے تھے اس لیے میں نے گھر سے نکلنا کچھ کم کر دیا تھا۔ کئی دن سے جمال کی طرف بھی جانا نہیں ہوا تھا نہ وہ کہیں ملا تھا۔ میں نے ایک دن یاد صدیقی کو ساتھ لیا اور جمال کے گھر پہنچ

گیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کے جو دو چار خفیہ ٹھکانے تھے' وہاں دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس شام ہم اسے اس طرح ڈھونڈتے پھرے جیسے بے چور سیاہی کھیلتے ہیں۔ اب ایک ہی جگہ رہ گئی تھی۔ ہم شاہد بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا بلکہ یہ معلوم ہوا کہ وہ کئی دن سے وہاں نہیں آیا ہے۔ شاہد بھائی خود پریشان تھے۔ کبھی کبھی وہ انجولی' اپنے بھائی کے گھر چلا جاتا تھا۔ جب جاتا تھا گناہ بخشوا کر جاتا تھا لیکن اب تو وہ بس غائب ہوگیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے پائی تھی کہ وہ گیا کہاں۔ اس کا مطلب تھا وہ یہیں کہیں ہے۔ اچانک مجھے درد اسعدی کا خیال آیا لیکن قباحت یہ تھی کہ اگر میں اس وقت ظاہر کردیتا کہ وہ کہاں ہوگا تو شاہد بھائی بھی ساتھ ہولیتے۔ مجھے معلوم تھا وہ اس وقت وہاں کیا کر رہا ہوگا۔ اگر شاہد بھائی اس حالت میں اسے دیکھ لیتے تو بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ شاہد بھائی کے پیٹ میں کوئی بات رہتی نہیں تھی۔

"چلو درد اسعدی کی طرف چلتے ہیں۔" میں نے باہر نکل کر یاد سے کہا۔

اس کا موڈ نہیں ہوا اور میری اکیلے جانے کی ہمت نہیں تھی لہٰذا ہم لوٹ آئے۔

اگلے دن میں اور یاد صدیقی امبیری ہوٹل پر بیٹھے تھے کہ وہ آگیا۔ میں اس سے خفا تھا لیکن اس سے خفا کون ہوسکتا تھا۔ آتے ہی اپنے نہ ملنے کے ایسے ایسے جواز دے ڈالے اور میری کاہلی کے اتنے طعنے مجھے دیے کہ ہم الزام اس کو دیتے تھے' قصور اپنا نکل آیا۔ وہ جلدی میں تھا' صرف یہ کہنے آگیا تھا کہ میں شام کو شاہد الوری کے گھر پہنچ جاؤں۔

"قمر ہاشمی کو شاہد بھائی کے گھر بلایا ہے۔ تم بھی آجانا۔"

وہ اپنی ہر دریافت کو اسی طرح کبھی اپنے گھر کبھی شاہد بھائی کے گھر بلاتا ضرور تھا۔ کون سی دریافت کو کہاں بلایا جائے' اس کا شعور اسے تھا۔

"اس مولوی کو لے کر مت آنا۔" اس نے ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اس کا اشارہ یاد صدیقی کی طرف تھا۔

"مولوی تو میں ہوں' اسے کیوں گناہ گار کرتے ہو۔"

"تم شاعر اچھے ہو اس لیے تمہاری مولویت دب سکتی ہے۔" اس نے کہا اور بھاگتا ہوا اسی رکشا میں بیٹھ گیا جس میں وہ آیا تھا۔

مغرب سے ذرا بعد کا وقت تھا کہ میں نے شاہد بھائی کو آواز دی۔ انہوں نے گردن نکال کر مجھے دیکھا اور اندر بلالیا۔ قمر ہاشمی مجھے سامنے ہی بیٹھے نظر آگئے۔ ٹیبل پر گلاس' بوتل اور کچھ کھانے کی چیزیں رکھی تھیں۔ قمر ہاشمی دُبلے پتلے آدمی تھے۔ غالباً پند قطرے پیٹ میں اتر گئے تھے کہ اور بھی سمٹے سمٹے نظر آرہے تھے البتہ جمال خوب چوڑا ہو رہا تھا۔ پورے صوفے پر اکیلا بیٹھا تھا۔

"یار جانی' آگیا تو۔" پھر قمر ہاشمی سے مخاطب ہوا "یہ میرا یار ساجد رام پوری ہے۔ مجھ سے اچھا شاعر ہے مگر میں نہیں جانتا۔"

قمر ہاشمی نے کوئی جواب نہیں دیا' صرف یہ کیا کہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو اور چھوٹا کرلیا۔ اس کا مطلب تھا وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اس لیے جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

جمال کے چہرے پر آتش بازی کا سماں تھا۔ کوئی اس کے اندر ایسی ہولی کھیل رہا تھا کہ رنگوں کی دھنک رخساروں پر اتر آئی تھی۔ میں نے اسی وقت ایک شعر موزوں کرکے اسے سنادیا۔

ہنس رہے ہیں گلاب چہروں پر
جل رہا ہے چراغِ جرعۂ مے

وہ عالمِ سرخوشی میں بہ اندازِ رقص کھڑا ہوا اور اپنا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کیا کرتا' میں نے بھی دو نٹ تر کرلیے۔

"میں اعلان کرتا ہوں کہ ساجد مجھ سے بڑا شاعر ہے۔" اس نے کہا اور بیٹھ گیا "اس زمین میں اسی وقت غزل کہہ کر قمر بھائی کو سناؤ۔"

"شعر تو اتفاق سے ہوگیا' غزل اس طرح تھوڑی ہوتی ہے۔" میں نے معذرت کی۔

"یار تو کوشش تو کر۔ جتنے شعر بھی ہوتے ہیں۔"

"رات کے جاگے ہوئے۔" سے انتخاب

دنیا جمال کچھ بھی کہے جانتا ہوں میں
سارا سفر ہے میرا غزل کی تلاش میں

آگاہ میں چراغ جلاتے ہی ہوگیا
دنیا مرے حساب سے بڑھ کر خراب ہے

اس کی نظر بدلنے سے پہلے کی بات ہے
میں آسمان پر تھا' ستارہ زمین پر

مقصود صرف ڈھونڈنا کب تھا تجھے' سو میں
جس سمت تو نہیں تھا اُدھر بھی نکل گیا

بہکا رہا ہے کون مجھے یوں تیرے خلاف
اِک مرتبہ خود اپنی طرف دھیان بھی گیا

جو دل کے طاق میں تو نے چراغ رکھا تھا
نہ پوچھ میں نے اسے کس طرح ستارہ کیا

تمام ارض وسما کو گواہ کرتا ہوا
کوئی گزر گیا مجھ پر نگاہ کرتا ہوا

ہر ایک گوشۂ کون ومکاں کی سیر کے بعد
جو اپنی سمت نہ لے آئے وہ سفر کیا ہے

○☆○

اس نے اتنی ضد کی کہ میں شعر کہنے بیٹھ گیا۔ وہ ایسے عالم میں تھا کہ میں اس کی بات ٹال ہی نہیں سکتا تھا۔

میں جب اپنی دانست میں غزل کہہ چکا تو اس وقت تک قمرہاشمی کے لیے صوفہ خالی کیا جا چکا تھا اور وہ اس پر لیٹ گئے تھے۔ جمال اپنا پیٹ پکڑے ان کی حالت پر ہنس رہا تھا۔

"قمر بھائی' ساجد نے غزل کہہ لی ہے۔ اب کچھ شاعری ہو جائے۔" جمال نے کہا اور قمرہاشمی نے آنکھیں کھول دیں۔

"سنا بھئی' غزل سنا۔" شاہد بھائی نے حکم دیا۔

قمرہاشمی نے اتنی مروت کی کہ غزل کے احترام میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے' جو شعر ہو گئے تھے سنانے شروع کیے۔

جشن گریہ نہ بزم نغمہ ونے
زندگی کس قدر عذاب میں ہے
بول اٹھے راستوں کے سناٹے
تیری آواز ہے کہ جادو ہے
بیش از جاں برائے مردِ فقیر
جز محبت نہ کوئی نام نہ شے
کیوں چٹانیں خموش رہتی ہیں
کیا بتائے خروشِ سینۂ نے
ہنس رہے ہیں گلاب چہروں پر
جل رہا ہے چراغِ جرعۂ مے
پاؤں ٹوٹیں کہ حوصلہ ٹوٹے
کیا کریں راستہ اکیلے طے
بجھ گیا شعلۂ صدا لیکن
ہے ابھی تک وہی مزاج کی لے

"شاہد بھائی' اتنی اچھی غزل کے بعد ہم پر قرض ہو گیا کہ اسے بھی شاعر بنا دیں۔" جمال نے کہا اور اپنے ہاتھ سے قمرہاشمی کے گلاس میں میرے لیے بھی انڈیل دی۔

"شاہد بھائی' یہ آپ نے کس راہ پر ڈال دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے نہیں ڈال دیا۔ یہ میڈان درد اسعدی ہیں۔ وہاں سے پاک ہو کر میرے پاس تشریف لائے ہیں۔"

"تو پی یار اپنے دوست کی خاطر۔" جمال نے کہا۔

شاعری کی دُھن میں ان دنوں میں یہ سوچتا ضرور تھا کہ اس آتش سیال کو شعرا کیوں اتنا عزیز رکھتے ہیں۔ کبھی اس دُخت رز کو منہ لگا کر دیکھا تو جائے۔ اب جو اصرار ہوا تو انکار میں بھی نہ کر سکا۔

قمرہاشمی تو کب کے ڈھیر ہو چکے تھے البتہ جمال برابر میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی تیز رفتاری یہاں بھی کام دکھا رہی تھی۔

شاہد بھائی نے پائے بنوائے تھے لیکن قمرہاشمی کا اصرار تھا کہ وہ گھر جائیں گے۔ مجبوراً' رکشا منگوایا گیا اور وہ گھر چلے گئے۔

"یار' اس اپنے جمال کو شہرت ملنی چاہیے۔" شاہد الوری نے کہا۔

"کیا اب یہ مشہور نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسی شہرت نہیں' ملک گیر شہرت۔ اسے کوئٹہ بھی لے کر جائیں گے۔ کیپٹن عشرت وہاں رہتا ہے۔ اس سے کہہ کر مشاعرہ رکھوائیں گے۔ تو بھی تیاری رکھ۔" انہوں نے کہا "لیکن اس سے پہلے ایک حرکت اور کرنی ہے۔ ڈگری کالج میں انعامی مشاعرہ ہے۔ منظر ایوبی میرے پاس آئے تھے۔ مجھے جج بنایا ہے لہٰذا پہلا انعام جمال کو دلوانا ہے۔"

"لیکن شاہد بھائی' وہ تو طلبہ کے درمیان مقابلہ ہو گا۔"

"یہ تو کہہ رہا تھا' یہ بی۔ اے کر رہا ہے۔"

"یہ پرائیویٹ بی' اے کر رہا ہے اور مقابلے میں شامل ہونے کے لیے کالج کا طالب علم ہونا ضروری ہے۔"

"یہ کون سی نئی بات تو نے بتائی۔ کسی بھی کالج کا طالب علم بنا دیں گے اسے۔ کون پوچھتا ہے۔ منظر ایوبی تو اپنا یار ہے۔ کئی مشاعرے ہم نے ایک ساتھ پڑھے ہیں۔"

"وہ مان جاتے ہیں تو ٹھیک ہے۔"

"ایک جج تمہیں بنوا دیں گے۔ پھر تو انعام بالکل ہی پکا ہے۔"

کورنگی سائنس کالج میں یہ بین الکلیاتی مشاعرہ ہوا جس میں جمال بطور طالب علم شاعر شریک ہوا۔ مہمان خصوصی صہبا اختر تھے اور منصفین میں شاہد بھائی اور میرا نام شامل تھا۔

اس مقابلے کا پہلا انعام ظاہر ہے جمال کو ملا۔ دوسرا انعام ہم نے انور سن رائے کو دیا جو اس وقت اپنا نام انور اقبال لکھتا تھا۔ تیسرا انعام طاہر مسعود کو ملا تھا۔

بہت دن تک شاہد بھائی مشاعروں میں جمال کو یہ کہہ کر متعارف کرواتے رہے کہ اب تشریف لاتے ہیں جمال احسانی جنہوں نے ڈگری سائنس کالج کورنگی کے مقابلۂ شعر خوانی میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔

اب جمال احسانی کچھ شاہد بھائی کے ذریعے کچھ اپنی کوششوں سے گاہے گاہے شہر کے مشاعروں میں جانے لگا تھا۔ جب بھی وہ شہر کی یاترا سے لوٹتا تھا' اپنی کامیابی کے افسانے بڑھا چڑھا کر یا شاید مبنی بر حقیقت سنایا کرتا تھا۔ آج محسن بھوپالی سے ملاقات ہوئی۔ رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہو رہے ہیں۔ وہ مجھے ممبر بنوائیں گے۔ میں ان کے ساتھ کئی شاعروں کے گھر گیا۔ تیرے یار کی غزلیں سن کر سب حیران رہ گئے۔

سجاد میر سے ملاقات ہوئی۔ کیا بلا کا بولنے والا ہے' میرا بڑا حمایتی ہے۔ میرا نام اس نے پہلے سے سنا ہوا تھا یار۔ ملاقات ہوئی تو فریفتہ ہی تو ہو گیا۔ فراست رضوی تو اپنی جیب میں ہی ہے۔ میں نے اب تک اسے گھاس ہی نہیں ڈالی تھی۔ وہ بھی خوب ہے۔ جس طرح ہم باتیں کرتے ہیں' اسی تیزی سے وہ شعر کہتا ہے۔ تمہیں اپنی زود گوئی پر بڑا ناز ہے۔ کبھی اس سے ملو سالے۔

ایک دن آیا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔ ایک فاتح تھا جو اپنی فتح کے نشے میں جھوم رہا تھا۔

"آج سو ملاقاتوں کی ایک ملاقات ہوگئی۔ احمد جاوید نے مجھے سلیم احمد سے ملوایا۔ گوتم بدھ کی طرح بیٹھے تھے اور عقل بانٹ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے' اچھا' آپ بھی ہیں اس توتلی نسل کے نمائندے۔ پھر خود ہی قہقہہ مار کر ہنسے۔ یار کیا جاندار قہقہہ ہے ان کا۔ جب مجھے ہلا جُلا کر جانچ پرکھ چکے تو میری غزلیں بھی سنیں۔ یار ساجد' میری غزلیں سن کر انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔ کہنے لگے' تم تو توتلی نسل کے نمائندے نہیں ہو۔ تم تو لمبی دوڑ کے شاعر ہو۔ انہوں نے مجھے بہت سی نصیحتیں بھی کی ہیں۔ اب جو غزلیں کہوں گا' ان کی نصیحت کی روشنی میں کہوں گا۔ ہم سالے لفظوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ مزہ تو جب ہے کہ گھر کا لفظ شعر میں نہ آئے مگر تصور گھر کا ابھرے۔ مگر ایک بات ہے' وہ جدید شاعری سے خوش نہیں ہیں۔ یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر احمد جاوید سے ڈسکس کروں گا وہ کیا کہتا ہے۔"

اب جب بھی وہ انچولی' اپنے بھائی کے گھر جاتا تو سلیم بھائی سے مل کر ضرور آتا۔ ایک مرتبہ ضد کر کے مجھے بھی لے گیا لیکن میری فطری کاہلی نے یہ موقع بہت کم کر دیا کہ میں کورنگی سے نکل کر بار بار وہاں جاتا رہوں' ہاں کبھی کبھی کی بات دوسری تھی۔ وہ بھی جمال کے ساتھ۔

سلیم احمد کے گھر جانے اور احمد جاوید کی قربت نے اس کی شاعری پر بڑے خوش گوار اثرات مرتب کیے۔ بہت سے نئے شعرا کی طرح اس کے دل میں اساتذہ کی شاعری کی طرف سے بغاوت پیدا نہیں ہو سکی۔ کلاسیک کا احترام اس کے دل میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس احترام نے زبان کی تراش خراش' الفاظ کے حسن' بندش کی چستی اور محاورات کے برجستہ استعمال کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کی فطری ذہانت نے ان سب چیزوں کو ایک لڑی میں پرو کر اس کی شاعری کے حوالے کر دیا۔ اس نے کلاسیک کی نقالی نہیں کی بلکہ عصری پس منظر میں اس روایت کو برتنے کا ہنر سیکھا۔ تجربات و مشاہدات سے اپنے موضوعات کسب کیے اور مشرق کی شعری روایت سے انہیں جوڑ دیا۔

اس وقت اس کی شاعری عشقیہ موضوعات تک محدود تھی۔ اس لیے کہ اس کے تجربات یہی تھے۔ لفظیات کے اس پرانے کھیل کے باوجود تازگی اس لیے نظر آتی تھی کہ یہ اس کے تجربات تھے۔ بقول رئیس امروہوی ؎

یارب غمِ عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے

جب تجربہ نیا ہو' کسی کے پاس اسے بیان کرنے کی قدرت بھی ہو تو تازگی اور نیا پن کیسے پیدا نہ ہو۔

○☆○

"تم کل شام کو گھر پر رہنا۔ میں کسی کو لے کر آؤں گا۔" جمال نے کہا۔

"گھر والوں کو کہیں بھیج دوں یا چلے گا۔"

"ابے نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔"

"پھر لانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں نہیں لا رہا ہوں۔ آپ کا دولت خانہ دیکھنے کی تمنا ان کی ہے۔"

"ٹھیک ہے' چشم ما روشن۔"

وہ توبہ شوشہ چھوڑ کر چلا گیا اور میں دوسرے دن شام تک اس فکر میں مبتلا رہا کہ دیکھیے عالم غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ آنے والا یا آنے والی کون ہے۔

دوسری شام وہ وعدے کے مطابق آ گیا۔ اس کے ساتھ وہی شاعرہ کھڑی تھی جس سے ہم نواب تصور کے یہاں مل چکے تھے اور جو ازراہِ مہربانی و میزبانی ہمیں اپنے گھر لے گئی تھی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جمال کو وہ شاعرہ اب تک یاد ہوگی لیکن پھر وہی بات کہ وہ جس سے ملنا تھا اسے اپنے گھر ضرور بلاتا تھا۔ وہ اس شاعرہ کو بھی نہ صرف اپنے گھر لے کر آیا بلکہ میرے گھر بھی لے آیا۔

وہ اکیلی آئی تھی' اس کا شوہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ آئی ایسے وقت تھی کہ اسے اپنے گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو جاتی لہٰذا بیٹھتے ہی جانے کی جلدی کرنے لگی۔

میری والدہ اور بہن سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جمال نے راستے میں مجھے بتایا کہ وہ صبح ہی اسے لے کر آ گیا تھا۔ باتوں میں وقت گزرتا رہا پھر ہماری اماں اپنی کتھا کہانی لے کر بیٹھ گئیں اور یہ وقت ہو گیا۔

"یار' تو ایک کام کر۔" جمال نے کہا "اب اندھیرا ہو گیا ہے اور یہ بے چاری اکیلی ہے۔ تو اسے اس کے گھر تک چھوڑ آ۔"

"میں اسے شہر چھوڑنے جاؤں اور پھر اکیلا واپس آؤں؟"

"یار' ایک دوست کے لیے تو اتنا بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا اور میں تیار ہو گیا۔

بس میں ہم دونوں ایک ہی سیٹ پر برابر برابر بیٹھے۔ تو کیا ہوا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک رشتہ بھی تو تھا' شاعری کا۔

تقریباً گھنٹے بھر کا سفر منٹوں میں کٹ گیا۔ ہم بس سے اترے۔ چھوٹا سا ایک میدان پار کر کے وہ گھر تھا جہاں اسے جانا تھا۔ یہ اس کا نہیں اس کی کسی سہیلی کا گھر تھا۔

"تمہیں جمال نے کچھ بتایا ہے" اس نے میدان پار کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔ کس بارے میں؟ مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔"

"راستے میں تمہاری گستاخیوں سے تو میں یہی سمجھی تھی۔" اس

نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دل میں چور تھا اس لیے میں نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی اور اسے گھر کے قریب چھوڑ کر واپس آگیا۔

○☆○

جمال کا تمام سفر غزل سے غزل تک محدود تھا۔ میں جب کسی کے لیے سہرا لکھتا یا سلام اور قصیدے کی محفلوں کے لیے شعر کہتا تو وہ مجھ پر ہنستا بہت تھا۔

دنیا جمال کچھ بھی کہے جانتا ہوں میں
سارا سفر ہے میرا غزل کی تلاش میں

دنیا کی دیکھا دیکھی نظمیں بھی کہنا چاہتا تھا اور نظمیں اس نے کہہ بھی رکھی تھیں لیکن اناڑی تھا غزل کے سوا ہر شعبے میں بس اپنی اکڑ میں وہ اس بات کو مانتا نہیں تھا۔

ایک روز ہم دونوں صدر میں گھوم رہے تھے کہ وزیری پانی پتی مل گئے۔ میں تو اس وقت انہیں نہیں جانتا تھا لیکن جمال ان سے واقف تھا۔

"ارے کو، کہاں گھوم رہے ہو۔"

"ایسے ہی، ایک کام سے آئے تھے۔ اب واپس جا رہے ہیں۔"

"اچھا ہوا تم مل گئے۔ طلوع افکار ایک پرچہ ہے۔ ہم احتشام حسین نمبر نکال رہے ہیں۔ تم بھی اپنی اپنی نظمیں دے دو، لگ جائیں گی۔ شرط یہ ہے کہ آزاد نظم کی فارم میں ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ہم کل تک آپ کو پہنچا دیں گے۔"

"کل تک نہیں، ابھی چاہیے ہیں۔"

"ابھی؟ یہاں کھڑے کھڑے؟" جمال نے کہا۔

"سامنے والے ہوٹل میں بیٹھ جاؤ۔ آزاد نظم کا کہنا ہی کیا۔ بیٹھے بیٹھے کھینچ دو۔ میں ذرا کتاب محل تک جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں آکر تم سے وصول کرلوں گا۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے اور ہم پریشان کھڑے تھے۔ ہمیں تو آزاد نظم کہنی بھی نہیں آتی تھی۔ وزیری صاحب سے پوچھنا، ہماری شاعرانہ غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ بہرحال، ایک دکان سے کاپی اور دو پنسلیں خریدیں اور اس ہوٹل میں بیٹھ گئے جہاں وزیری صاحب کہہ گئے تھے۔

ہم دونوں پنسلیں پکڑے بیٹھے تھے۔ میں احتشام حسین اور ان کی تنقید نگاری کے بارے میں بتا چکا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ آزاد نظم لکھتے کیسے ہیں۔

"ایسا کرتے ہیں، پہلے پابند نظم کہہ لیتے ہیں اور پھر ان شعروں اور مصرعوں کو توڑ توڑ کر لکھ دیں گے۔ کوئی مصرع چھوٹا ہوگا کوئی بڑا۔ یہی تو ہوتی ہے آزاد نظم۔"

ہم دونوں نے جلدی جلدی کچھ اشعار لکھے پھر آدھا مصرع، پورا مصرع ڈیڑھ مصرع کرکے پوری نظم میں بکھیر دیے۔ وزیری پانی پتی آئے تو دونوں نظمیں تیار تھیں۔ وہ نظمیں لے کر چلتے بنے۔

جب رسالہ آیا تو میری نظم اس میں شامل تھی، جمال کی نہیں تھی۔

بعد میں وزیری پانی پتی نے جمال کو بتایا کہ تمہاری نظم آزاد نہیں تھی لہٰذا شائع نہیں ہو سکی۔

جمال یہ اطلاع سن کر بہت دیر تک ہنستا بھی رہا اور شرمندہ بھی ہوا۔

"لعنت ہے۔ آئندہ آزاد نظم نہیں کہیں گے۔ تم کہا کرو سالے۔ میرے لیے میری غزل بہت ہے۔"

اس کے بعد وہ ماننے لگا تھا کہ وہ نظم کا شاعر نہیں ہے۔ یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ جب ترکیب ایک تھی تو یہ تفریق کیوں ہوئی۔

○☆○

شاہد الوری کورنگی نمبر ۲ پر رہتے تھے۔ یہاں سے سیدھی سڑک فراز سے نشیب کی طرف اترتی ہوئی ڈاکٹر جاوید کے کلینک تک جاتی تھی۔ ایک رات محسن اسرار، میں اور ڈاکٹر شاہد الوری اسی سڑک سے گزر رہے تھے کہ شاہد بھائی کو نہ جانے کیوں میری آوارگی پر رحم آگیا۔

"ساجد، تمہیں کیا تنخواہ ملتی ہے۔" انہوں نے عجیب ذاتی سا سوال کیا۔ بہرحال، میں نے انہیں تنخواہ بتا دی۔

"نوکری تو پکی ہے؟"

"ایک دم پکی۔ ایسی پکی کہ ہفتے ہفتے بھر نہیں جاتا مگر میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔"

"ایم۔ اے تو کرلیا ہے؟"

"وہ بھی کرلیا ہے۔"

"ابے تو پھر کیا ہے۔ شادی کیوں نہیں کرلیتا۔"

"ابھی تو شاعری سے فرصت نہیں ہے، شادی کیسے کرلوں۔"

"رہنے دے بھائی۔ ایک وہ ہیں جمال احسانی۔ وہ تو گئے ہمارے ہاتھوں سے، اب تم بھی جاؤ گے۔ اپنا گھر بساؤ اور بیٹھ جاؤ ٹک کر۔"

"مجھ آوارہ گرد کو بیٹی دے گا کون۔"

"تو کے تو بات کروں۔ میرے ایک دوست کی بچی ہے۔ بی اے ہے اور عمر صرف انیس سال۔"

میں نے سوچا، شاہد بھائی کی عادت مذاق کی ہے، یہ بھی ان کے مذاق کی کوئی قسم ہوگی۔

مذاق کی بات تھی لیکن وہ تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔ انہوں نے جمال کو میرے پیچھے لگا دیا جو اٹھتے بیٹھتے مجھے فریضۂ شادی پر اکساتا رہتا تھا۔

میں مذاق سمجھ رہا تھا لیکن انہوں نے لڑکی والوں سے بات بھی کرلی اور شاہد بھائی نے مجھ سے فوٹو کی فرمائش کردی۔

کپڑے پہنوں، دکان پر جاؤں، فوٹو کھنچواؤں۔ یہ سب میرے بس کا نہیں تھا اور جبکہ یہ اصرار ہو کہ کورنگی میں فوٹو گرافر اچھے نہیں ہیں، صدر جا کر کھنچوانا۔

مجھ سے زیادہ میری گرفتاری کی خوشی جمال کو تھی۔ وہ ایک دن

مجھے پکڑ کر صدر لے گیا۔ ایک فوٹو اپنا کھنچوایا' ایک میرا۔

فوٹو شاہد بھائی کے حوالے کرنے کے بعد میں پھر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا لیکن دل دھڑکنے ضرور لگا تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا۔ اپنی ذات سے اتنی امید تو ضرور تھی کہ انکار تو ہو ہی نہیں سکتا۔ فوٹو میرا اور پھر جمال بیچ میں تھا۔

اس منزل تک آکر بھی میں سنجیدہ نہیں تھا۔ اسی لیے اپنے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

ایک روز جمال آیا اور مجھے شاہد بھائی کے گھر لے گیا۔ ہم وہاں جاتے ہی تھے اس لیے مجھے شک بھی نہیں ہوا لیکن جب دو اجنبی عورتیں میرے سامنے آکر بیٹھ گئیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مجھے دیکھتی رہیں' مجھ سے کچھ پوچھتی رہیں۔ شاہد بھائی نے پُرتکلف ناشتا کرایا اور جمال ان خواتین کو چھوڑنے ان کے گھر چلا گیا۔

"ان میں ایک تیری ساس تھیں' ایک سالی۔" شاہد بھائی نے ان کے جانے کے بعد مجھے بتایا۔

"میں سمجھ گیا تھا۔"

"جب سمجھ ہی گیا تھا تو اب رزلٹ کا انتظار کر اور تیاری پکڑ۔"

"اوئے' اب مذاق نہیں ہو رہا ہے۔ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔"

"میں نے تو اپنی والدہ تک کو نہیں بتایا۔"

"یہ لوگ تجھے پسند تو کر لیں پھر تیری والدہ کو بھی بتا دیں گے وہی کریں گی سب کچھ۔ ہم تو یہیں تک کے تھے۔"

جمال پلٹ کر آیا تو مارے خوشی کے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کون سی تعریف تھی جو اس نے اس گھرانے کی نہیں کی۔

کئی دن تک اس نے مجھ پر ایسی محنت کی کہ میں خواب محلوں میں رہنے لگا۔ گویا میں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔

یہ اذن ملتے ہی کہ مجھے پسند کر لیا گیا ہے' جمال اور شاہد بھائی میری والدہ کے پاس آئے اور انہیں بھی تیار کر لیا کہ وہ جا کر لڑکی دیکھ آئیں۔ انہوں نے لڑکی دیکھی اور پسند بھی کر لی۔ منگنی کی رسم بھی ادا ہو گئی اور یہ طے ہوا کہ شادی کی تاریخ بعد میں طے ہو جائے گی۔

○☆○

کورنگی میں کئی سال سے جشنِ کورنگی منایا جا رہا تھا۔ اس کے روحِ رواں کیف بنارسی تھے۔ اس جشن کے تحت تصویروں کی نمائش' موسیقی کے پروگرام' کھیلوں کے مقابلے اور مشاعرے وغیرہ ہوتے تھے۔ مشاعرہ کمیٹی میں شاہد الوری بھی شامل تھے۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں مجھے اور جمال کو خطابات سے بھی نوازا گیا تھا۔ میرے لیے "شہزادۂ شب" اور جمال کے لیے "جگر گوشۂ کورنگی" کا خطاب دیا گیا تھا۔

جن دنوں میری شادی کی بات چیت چل رہی تھی' جشنِ کورنگی کے تحت ڈگری سائنس کالج کورنگی میں مشاعرہ ہوا۔ جمال کو موقع مل گیا۔ اس نے شاہد بھائی کو مشورہ دیا کہ ساجد کی سسرال والوں اور لڑکی کو بھی مشاعرہ سننے کے لیے بلایا جائے۔ اس طرح لڑکی بھی اسے دیکھ لے گی اور وہ بھی لڑکی کو دیکھ لے گا۔ شاہد بھائی کو یہ تجویز پسند آئی اور ان لوگوں کو سامعین میں لا کر بٹھا دیا گیا۔

یہ کورنگی کا نہایت شاندار مشاعرہ تھا۔ شہر کے کئی شعرا اور شاعرات اس میں شریک تھیں۔ وہ شاعرہ بھی تھی جسے جمال ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض عشرت انجم انجام دے رہے تھے۔

شاہد الوری نے اسٹیج پر آکر نشان دہی کر دی تھی کہ جس لڑکی سے میری نسبت طے ہوئی ہے وہ کون سی ہے۔

مشاعرے کے اختتام کے بعد جمال نے یہ فراخ دلانہ پیش کش کی کہ تمام شاعرات اس کے گھر ٹھہر سکتی ہیں۔ صبح کا ناشتا اس کی طرف سے ہو گا' پھر ان شاعرات کو ان کے گھروں تک چھڑوا دیا جائے گا۔ شاید شاعرات سے بھی اس نے ساز باز کر لی تھی۔ وہ سب تیار ہو گئیں اور مشاعرے کی اصل رونق اس کے گھر میں جمع

"ستارۂ سفر" سے انتخاب

چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا
یہ سانحہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
نقشِ پا ڈھونڈتے ہو راہِ تمنا میں کہاں
یہاں موجودگی خاک نشینت جانو
مرا مکاں مری غفلت سے بچ گیا ورنہ
کوئی چُرا کے مرے بام و در چلا جاتا
یاد رکھنا بھی محبت میں نہیں ہے سب کچھ
بھول جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے
ہے واقعہ ہدف سیل آب تھا کوئی اور
مرا مکان تو بس راستے میں آیا ہے
بچھڑا تو اِک جہانِ تعلق اُجڑ گیا
جس جس سے رابطے تھے اسی کے سبب سے تھے
خس و خاشاک رہِ عشق ہوئے تو ہم سے
اور اِک رشتہ نسیم گزراں کا نکلا
میں اٹھتا تھا تو کہتی تھی سرائے
مسافر' شب یہیں رکنا پڑے گا
جہاں مامور کرتا ہے خدا تخریب کاروں کو
وہاں دو چار وہ بستی بسانے والے رکھتا ہے
اب اس سے کیجئے کیا شکوہ ہائے کم نگہی
بہت دنوں میں تو اس نے ادھر نظر کی ہے

○☆○

ہوگئی۔ پھر وہی بات کہ وہ جس سے ملتا تھا اسے اپنے گھر ضرور بلاتا تھا۔

اس رات کی ہم نشینی نے "اس شاعرہ" سے ہمیں مزید بے تکلف کردیا۔ پوری رات لطیفوں اور قہقہوں میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو اس کا آنگن سونا ہوگیا۔

رقابت کے جذبے سے کوسوں دور، ہم دونوں اس شاعرہ کے پرستار تھے۔

○☆○

جشنِ کورنگی کا مشاعرہ اس کے لیے جشنِ ملال بن کر آیا تھا۔ اک دستِ حنائی نے اس کی محرابِ غزل میں وہ چراغ روشن کیا جس کی روشنی میں وہ چمکا بھی بہت اور بجھا بھی بہت۔

دو آنکھیں بڑی دیر سے اس کی نگرانی پر مامور تھیں۔ وہ جب غزل پڑھنے کھڑا ہوا تھا تو کسی کی مخروطی انگلیوں نے لٹ سنوارنے کے بہانے اس کی خدمت میں آداب پیش کیا تھا اور جب اس نے توجہ دیے بغیر غزل شروع کردی تھی تو کسی کے ہونٹ تھرتھرائے تھے۔ جب وہ غزل ختم کرچکا تھا تو سب سے پہلے اسی ہاتھ نے تالی بجائی تھی۔ جب وہ اسٹیج سے اتر کر یونہی راہ داری کی طرف گیا تھا تو ایک لڑکی نے آٹوگراف بک اس کے سامنے بڑھادی تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ اس برقع پوش نے بس پلک جھپکنے کے لیے نقاب اٹھائی تھی۔ اس نے آٹوگراف بک پر اپنا ایک شعر لکھ کر دستخط کردیے تھے پھر اس پردہ دار نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ کاغذ کی طرف متوجہ ہوا، نظر اٹھائی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بھاگتا ہوا ہال کے اندر آیا۔ ایک لڑکی اپنی نشست پر بیٹھ رہی تھی۔ کیا یہی ہے؟ کیا خبر یہ نہ ہو۔ کیا خبر یہی ہو۔ ہاتھ سے ڈور کا سرا نکل گیا تھا، صرف کاغذ دبا ہوا تھا۔ بات ایسی نہیں تھی جسے سمجھنے کے لیے زمانے درکار ہوں۔ مجھے اس پتے پر بلایا گیا ہے۔ میں اپنی محسن کو دیکھ تو لوں۔ اسی وقت لڑکی نے گردن گھمائی۔ آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ گردن پھر اسٹیج کی طرف گھوم گئی۔ وہ بھی گھوم کر اسٹیج پر آگیا۔

دوسرے دن شاعرات کو رخصت کرنے کے بعد وہ بہت دیر تک اپنے دروازے پر کھڑا ہو کر کسی کے دروازے کا تصور کرتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے گھر سے دور ہوتا چلا گیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اس نے راستے کو آنکھوں سے ٹٹولا۔ وہ سائنس کالج کی طرف جارہا تھا۔ کاغذ پر جو پتا لکھا تھا وہ اسی طرف تھا۔ مکانوں کے نمبر پڑھتا ہوا وہ ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ وہ پہنچ تو گیا تھا لیکن دستک دیتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کسی نے پوچھ لیا کہ کس سے ملنے آئے ہو تو وہ کیا جواب دے گا۔ اس نے تو لڑکی کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح دیواریں تک رہا تھا۔

لوگوں کو تیرے کوچے کی رونق پہ سوجنا
ہم کو ترے مکان کی دیوار دیکھنا

اسی وقت ایک بچہ گھر سے باہر نکلا۔ اس پر نظر پڑتے ہی بچہ ٹھٹک کر رک گیا۔

"تم یہیں رہتے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو یہاں باجی سے پڑھنے آتا ہوں۔"

"اپنی باجی سے کہنا، شاعر انکل آئے ہیں۔"

"کون انکل؟"

"شاعر انکل۔" جمال نے دُہرایا۔

وہ بچہ اندر چلا گیا۔ اس نے خطرہ مول لیا تھا اس لیے بھاگنے کو بالکل تیار کھڑا تھا لیکن یہ نوبت نہیں آئی۔ وہ بچہ واپس آگیا۔

"باجی آرہی ہیں، آپ یہیں کھڑے رہیے۔"

وہ وہیں کھڑا رہا۔ ایک لڑکی دروازے پر آئی۔ جمال کو ایک نظر دیکھا اور آنکھیں بچھادیں۔

"آیئے نا، باہر کیوں کھڑے ہیں۔"

"آپ نے پہچان تو لیا ہے؟ میں وہی ہوں یا کوئی اور ہوں۔"

"آپ تو باتوں میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ ویسے مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ آئیں گے۔"

اس نے جمال کو اندر لے جا کر بٹھایا۔ بھاگتی ہوئی گئی اور پانی کا گلاس لے کر آگئی۔

"ابھی امی بھی آپ سے ملیں گی۔ وہ بھی شعر کہتی ہیں اور شاعروں کو بہت پسند کرتی ہیں۔"

"اور آپ؟"

"میں نے ہی تو آپ کو بلایا ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"آپ کے مہمان کو وہ پسند کریں نہ کریں؟"

"مہمان کے پسند نہیں ہوتے اور پھر آپ جیسا خوب صورت شاعر۔"

"آپ پڑھتی ہیں؟"

"میں نے بی اے کیا ہے۔ آپ جیسی عالم فاضل تو نہیں ہوں لیکن شعر سمجھ لیتی ہوں، آپ فکر نہ کریں۔"

"اصل بات تو شاعر کو سمجھنے کی ہوتی ہے۔ شعروں کی تفہیم تو پھر خود ہو جاتی ہے۔"

اس کی والدہ معمر خاتون تھیں لیکن گفتگو سے زندہ دل معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ ان کے سامنے ایک شاعر بیٹھا ہے، باتوں کے درمیان کوئی نہ کوئی شعر پڑھ دیتی تھیں۔ ان کے شعر پڑھنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اشعار کو سمجھتی بھی ہیں۔

"اور تو کچھ نہیں ہے، آپ آتے رہیں گے تو ہمارے ویرانے میں بہار آتی رہے گی۔" اس کی والدہ نے جنہیں اب جمال بہت دیر سے امی کہہ رہا تھا۔

"آپ کے گھر میں تو خود بہار موجود ہے۔"

اس لڑکی کا نام بہار تھا۔ جمال نے اپنی دانست میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مگر ویرانے میں ہے۔" بڑی بی نے کورنش کے انداز میں گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"آیئے جمال احسانی صاحب چائے پی لیجئے۔" بہار نے کہا۔

وہ ڈرائنگ روم سے برآمدے میں آیا جہاں ڈائنگ ٹیبل پڑی تھی۔ اس پر اتنی چیزیں سجی ہوئی تھیں کہ وہ حیران ہوگیا۔

"آپ نے تو بڑا اہتمام کرلیا۔" جمال نے کہا۔

"آپ کے آنے تک زندہ رہنا تھا ورنہ ہم تو وہ ہیں کہ دل نکال کر رکھتے۔" بہار کی ماں نے کہا۔

"امی، کمال کی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میں تو یہ سوچنے لگا ہوں کہ یہاں سے جانے اور دوبارہ آنے کے درمیان جو وقفہ آئے گا وہ کیسے گزاروں گا۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بھیا۔ آپ لوگ شاعر ہیں، باتیں تو آپ پر ختم ہیں۔"

وہ بہار کی والدہ سے کہہ رہا تھا لیکن آنکھیں بہار پر جمی ہوئی تھیں۔ بہار کی شربتی آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی تھی۔ سنہری بالوں کی ایک لٹ مستقل اس کے رخساروں کی نگرانی کررہی تھی۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر کبھی نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ ڈیرا ڈالے ہوئی تھی۔ اسے خوب صورت کہا جاسکتا تھا بلکہ جمال تو یہ سوچ رہا تھا، اتنی خوب صورت لڑکی نے مجھ میں دیکھا کیا ہے۔

وہ ٹیبل سے اٹھا تو بہار سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس لے کر آگئی۔ اس نے سگریٹ منہ سے لگایا اور بہار نے اپنے ہاتھ سے اس کی سگریٹ جلائی۔

"ہمارے گھر میں کوئی مرد تو ہے نہیں جو سگریٹ پیئے۔ یہ سگریٹ میں نے خاص طور پر آپ کے لیے منگا کر رکھے تھے۔"

"میرا برانڈ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"واہ، کل مشاعرے میں، میں نے آپ کے ہاتھ میں یہی پیکٹ دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ یہی سگریٹ پیتے ہوں گے۔"

جمال نے سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے ایش ٹرے نظر نہیں آئی۔

"یہ راکھ میرے ہاتھ پر گرا دیجئے، میں ایش ٹرے لاتی ہوں۔" بہار نے ایک ہاتھ کی کٹوری بنا کر اس کے سامنے کردی۔

وہ بھاگی ہوئی گئی اور ایش ٹرے لے آئی۔

اب اس کی والدہ بھی آکر ان کے درمیان بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بوسیدہ سی ایک کاپی تھی۔

"کبھی جوانی میں کچھ غزلیں کہی تھیں۔ ماحول بنانے کے لیے ایک غزل سنائے دیتی ہوں۔ پھر آپ سنایئے گا۔"

انہوں نے غزل سنائی اور پھر جواب میں جمال کو کئی غزلیں

غزل

مدتوں بعد شبِ ماہ اسے دیکھا تھا
پر کسی اور کے ہمراہ اسے دیکھا تھا
کیا خبر تھی کہ کہانی کوئی بن جائے گی
میں نے کل بزم میں ناگاہ اسے دیکھا تھا
آج اِک عمر کے بعد اس سے ملا تھا لیکن
اپنے احوال سے آگاہ اسے دیکھا تھا
وصل کی رات ستاروں نے بڑی حسرت سے
گاہ دیکھا تھا مجھے گاہ اسے دیکھا تھا
اس کا کیا ٹھیک کہ لوگوں نے بہ یک وقت جمالؔ
سرِ میخانہ و درگاہ اسے دیکھا تھا

سنانی پڑیں۔ ایسی پر خلوص داد اسے کہیں نہیں ملی ہوگی جیسی یہاں مل رہی تھی۔ شاعری کا دور ختم ہوا تو پھر چائے آگئی۔

"امی، ابھی بہار نے بتایا کہ آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ آپ دونوں اکیلی کیسی رہ لیتی ہیں۔" جمال نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ ہم ہی مرد ہیں، ہم ہی عورتیں۔ بہار کے ابو کا میری جوانی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ ایک بیٹا ہے، وہ امریکا میں اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہے۔ اتنا بھیج دیتا ہے کہ ہم سے کھایا نہیں جاتا۔ سال دو سال بعد آ بھی جاتا ہے لیکن ہیں تو ہم اکیلے۔"

"آپ بھی وہیں چلی جائیں۔"

"بس یہی وہ نہیں چاہتا۔ مجبوری ہے اپنی اپنی۔"

وہ اس گھر سے نکلا تو دن گزر گیا تھا۔ ایک ایسا دن جو اس کی زندگی کا یادگار دن تھا۔ اس کے کانوں میں بہار کی ماں کی آواز گونج رہی تھی۔

"بیٹا، تم آتے جاتے رہنا۔ میں سمجھوں گی میرا بیٹا امریکا سے آگیا ہے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ لائٹر نکال کر دیکھنے لگا جو چلتے وقت بہار نے اسے نشانی کے طور پر دیا تھا۔

اب اس کی باری تھی کہ وہ مجھے ڈھونڈے۔ وہ مجھے ڈھونڈتا پھرا اور میں رات گئے اسے دکن ہوٹل پر مل گیا۔ اسے نئی فتح کی کہانی سنانی تھی۔ اس رات کا ایک بڑا حصہ ہم نے سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے گزار دیا۔ اسے جو لائٹر بہار نے دیا تھا، اسے جلانے کے شوق میں ہم نے دسیوں سگریٹ پھونک ڈالے۔

اس کی فتوحات کی فہرست بہت طویل تھی لیکن یہ نیا عشق اس کی رگوں میں اترتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ لگتا تھا، یہ نئی کہانی بڑی دور تک اس کے ساتھ جائے گی۔ ضمنی کردار آتے رہیں گے

لیکن مرکزی کردار بہار کا ہوگا۔ اس نے اپنی ذات میں کبھی اتنی دلچسپی نہیں لی تھی جتنی اب لے رہا تھا۔ کسی سے ملتا تھا تو ٹوٹ کر ملتا تھا لیکن اسے توڑ کر خود الگ ہوجاتا تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی لیکن اب میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ وہ خود ٹوٹ کر رہے گا۔

اب اس کی غزلوں کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ اس نئی واردات کی جھلکیاں اس کی غزلوں میں نمایاں نظر آنے لگی تھیں۔

وہ آنکھ چپکے سے یوں دل کے بھید کہہ جائے
کہ جیسے بات کوئی یاد آکے رہ جائے
نہ وہ حسین نہ میں خوب رو مگر اِک ساتھ
ہمیں جو دیکھ لے وہ دیکھتا ہی رہ جائے
جب اسے دیکھو آنکھ اور دل کو ساتھ ملالینا
اِک آئینہ کم پڑجائے گا حیرانی میں
دیکھ کے بام پہ میرا چاند
آج کی رات نہ نکلا چاند
یہ اسی آنکھ کا حصہ ہے کہ ہم ایسوں کو
کم نگاہی پہ بھی رکھتی ہے اثر میں اپنے

○☆○

شیخ رؤف جو شاعرِ پنجاب کہلاتے تھے۔ جن کا لکھا ہوا ایک فلمی نغمہ "سانوں نہر والے پُل تے بلا کے" بہت مقبول ہوا' شاہد بھائی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ جمال اپنے گھر کرچکا تھا۔ ان کی ایک نظم "سرنامہ" نے دھوم مچادی تھی۔ لطیفہ سنج بھی ایسا تھا کہ روتے کو ہنسادے۔

ایک مشاعرہ ان کے اعزاز میں شاہد بھائی نے اپنے گھر بھی رکھا۔ جمال کے مشورے سے "وہ شاعرہ" اور اس کا شوہر بھی مدعو تھے۔

شیخ رؤف اپنی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے کورنگی' لانڈھی کے شعرا میں بہت مقبول تھے لہٰذا سخن وروں کی بہت بڑی تعداد شاہد بھائی کی چھت پر جمع تھی۔ شیخ رؤف اہلِ پنجاب کے تن و توش کے ساتھ دولھا بنے بیٹھے تھے۔ شاہد بھائی کی بدحواسیوں' جمال کے فقروں اور شیخ رؤف کے جوابی حملوں نے اس چھت کو اکبر کا دربار بنا دیا تھا۔ باتیں تھیں تو مشاعرہ تھے۔ یہاں یہ حال کہ قہقہوں کے ہجوم میں سنجیدگی کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔

کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ رکا اور شاہد بھائی نے مشاعرہ شروع کیا۔ اسمٰعیل انیس نے شیخ رؤف کی شان میں منظوم نذرانہ پیش کیا اور پھر غزلوں نے اپنی جگہ بنالی۔

جب مشاعرہ شباب پر پہنچا۔ ہم نے اپنی غزلیں بھگتالیں' وہ شاعرہ بھی پڑھ چکی تو جمال کا فطری اضطراب اسے اکسانے لگا۔ کئی مرتبہ زینہ اتر کر نیچے گیا' پھر اوپر آگیا۔ اس کے ذہن کے کارخانے میں یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب ڈھل رہی تھی۔ اسے وہی بے چینی ہورہی تھی جو تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے ہوتی ہے۔

"اب بہت ہوگئی' یہاں سے چھوٹ لو۔" اس نے میرے کان میں کہا۔

"بینارہ یار' کہاں جائیں گے یہاں سے نکل کر۔"

"پوری بات تو سن۔ تیری سسرال والے گئے ہوئے ہیں۔ گھر خالی ہے' وہاں چل کر بیٹھیں گے۔ اسے بھی لے چلتے ہیں۔" اس نے "اس شاعرہ" کی طرف اشارہ کیا۔

اس تجویز پر تو میں بھی مچل گیا "چابی ہے تمہارے پاس؟"

"چابی کی کیا ضرورت ہے' عالم جو آیا ہوا ہے۔"

عالم میرے ہونے والے سالے کا نام تھا۔ وہ گھر میں اکیلا پڑا ہوا تھا لہٰذا مشاعرے میں آگیا تھا۔ سولہ سترہ سال کا لڑکا ہماری اسکیم کو کیا سمجھتا۔

"اس سے بات کرلی؟"

"اس سے کیا بات کرنی۔ بتادیں گے اسے بھی۔ تجھے پکا کرنا تھا۔"

"یار سوچ لے' میری ہونے والی سسرال کا معاملہ ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔ بس تو چپکے سے نیچے اتر کر گلی میں ہمارا انتظار کر۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور نیچے آگیا۔ میں بے قراری سے گلی میں ٹہل رہا تھا۔ انہوں نے آنے میں خاصی دیر لگادی تھی۔

میں نے دیکھا' عالم گھر سے باہر آیا۔ اس کے پیچھے جمال اور پھر وہ شاعرہ اور اس کا شوہر بھی آگیا۔

"جلدی سے گلی سے باہر نکل چلو کہیں شاہد بھائی اوپر سے دیکھ نہ لیں۔ وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے ہیں ورنہ وہ اترنے نہیں دیتے۔"

عالم نے اپنی سائیکل اٹھائی اور ہم تیز تیز چلتے ہوئے گلی سے باہر آگئے۔

عجیب بھگدڑ کا سماں تھا۔ یہ خوف ابھی بھی تھا کہ شاہد بھائی بھاگتے ہوئے آئیں گے اور ہمیں پکڑلیں گے۔ بالکل یہ معلوم ہورہا تھا جیسے ہم کسی کو اغوا کررہے ہیں۔ کچھ بھاگتے کچھ چلتے راستہ طے کررہے تھے۔ وہ شاعرہ کچھ تو عورت ہونے کی وجہ سے کچھ یہ کہ اس کا بدن بھاری تھا ہماری مطلوبہ رفتار سے چل نہیں پارہی تھی۔ جمال نے عالم کے ہاتھ سے سائیکل چھینی۔ خود سائیکل پر بیٹھا' اس شاعرہ کو آگے بٹھایا اور اس کے شوہر کو پیچھے۔ اب جو پیڈل پر پاؤں رکھا تو سائیکل نے ہلنے سے انکار کردیا۔ اتنا وزن ہوگیا کہ پہیوں نے زمین پکڑلی۔

"ابے کھڑے ہنس رہے ہو' دھکا دو پیچھے سے۔" جمال چیخا۔

اب ہمیں بھی ہوش آیا۔ میں نے اور عالم نے پیچھے سے دھکا لگایا' کچھ جمال نے پاؤں مارے اور سائیکل چل پڑی لیکن ظاہر ہے

اس طرح دھکے دیتے ہوئے کتنی دور جاسکتے تھے۔ اب شاہد بھائی کے گھر سے دور بھی آگئے تھے اس لیے سائیکل عالم کے حوالے کی اور ہم نے پیدل چلنا شروع کردیا۔

"تم جا کر گھر کھولو' ہم آتے ہیں۔" جمال نے عالم سے کہا اور وہ سائیکل پر بیٹھ کر ہوا ہوگیا۔

ہم پہنچے تو گھر کھلا ہوا تھا اور عالم آرام سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ راستے بھر کی گھبراہٹ' گھر پہنچتے ہی ہنسی کا فوارہ بن کر دور ہوگئی۔

میں اپنی سسرال میں پہلی مرتبہ آیا تھا اور وہ بھی اس عظیم الشان کارنامے کے ساتھ۔

عالم تو بچہ تھا پڑ کر سوگیا' ہم نے صحن میں کرسیاں بچھائیں اور بیٹھ گئے۔

اس شاعرہ کا شوہر بھی زیادہ دیر نیند کا مقابلہ نہ کرسکا اور کمرے میں جا کر سوگیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو سلانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ جب ایک' ایک سے ہوشیار نکلا اور کوئی سونے پر تیار نہیں ہوا تو ہم نے صلح کرلی۔

صلح کرلو یگانہ غالب سے
تم بھی استاد وہ بھی اک استاد

صحن میں گھنے شریفے کے پیڑ کے نیچے بچھی کرسیوں پر' خزانہ سامنے رکھ کر بیٹھ گئے کہ دیکھو کب کس کو اونگھ آتی ہے۔ کوئی تیرا نہیں تھا لہٰذا خزانہ ہم دونوں کا ہی تھا۔ ایک اشرفی تیری ایک میری۔ لعل میرے' یاقوت تیرے۔ یہ سونے کی ناک ہے' یہ چاندی کے رخسار ہیں۔ دیکھو' کوئی آتو نہیں رہا ہے؟ کون آئے گا۔ ہم ہی چوکی دار ہیں' ہم ہی چور ہیں۔

موذن مرحبا بروقت بولا۔ چلو اب چڑیوں کے آنے کا وقت ہوا' سوجائیں۔ وہ شاعرہ اپنے شوہر کے بستر میں دبک گئی۔ ہم بھی کہیں نہ کہیں سمٹ ہی گئے۔

صبح میں سو کر اٹھا تو عالم میرے جوتوں پر پالش کررہا تھا۔ آخر میں ہونے والا بہنوئی جو ہوا۔

○☆○

وہ بہار کے گھر پہنچا تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔

"جمال تمہیں خدا سمجھے۔ کیا رات بھر نہیں سوئے ہو۔ بال دیکھو کیسے اُجڑے اُجڑے ہورہے ہیں۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں' شاعروں کو اپنا ہوش نہیں رہتا۔"

"رات ایک مشاعرے میں تھا لہٰذا سویا نہیں۔"

"آپ نہالیں' پھر کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔"

"چھوڑو یار' نہانا کیا۔"

"تم تو گندے بھی بہت ہو۔" وہ ہنسنے لگی۔

"امی کہاں ہیں؟"

غزل

کوزۂ دنیا ہے اپنے چاک سے بچھڑا ہوا
اور اس کے بیچ میں افلاک سے بچھڑا ہوا
دن گزرتے جارہے ہیں اور ہجومِ خوش گماں
منتظر بیٹھا ہے آب وخاک سے بچھڑا ہوا
صبح دم دیکھا تو خنکی پر تڑپتا تھا بہت
ایک منظر دیدۂ نم ناک سے بچھڑا ہوا
اس جہانِ خستہ سے کوئی توقع ہے عبث
یہ بدن ہے روح کی پوشاک سے بچھڑا ہوا
جب بھی تولا بے نیازی کی ترازو میں اسے
وہ بھی نکلا ضبط کے ادراک سے بچھڑا ہوا
اِک ستارہ مجھ سے مل کر رو پڑا تھا کل جمالؔ
وہ فلک سے اور میں تھا خاک سے بچھڑا ہوا

○☆○

"ڈرو مت' ابھی آتی ہیں' پڑوس میں گئی ہیں۔" بہار نے ضد کرکے اسے غسل خانے میں دھکیل دیا اور کنڈی باہر سے بند کردی۔

"اچھی طرح رگڑ رگڑ کر نہانا اور نکلنے سے پہلے تولیا مانگ لینا۔"

نہانے کے بعد اس نے تولیا مانگا تو بہار نے تولیا کے ساتھ قمیص شلوار کا ایک سوٹ بھی اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔

"بھائی جان کا نیا سوٹ رکھا تھا۔ آپ کے فٹ آئے گا۔"

وہ نہا کر نکلا تو بہار کی امی آچکی تھیں اور کھانے پر اس کا انتظار کررہی تھیں۔

کھانے کے بعد وہ لیٹنے کا ہمیشہ سے عادی تھا۔ اتنی مرتبہ یہاں آچکا تھا لہٰذا بہار بھی اس کی عادت سے واقف ہوچکی تھی۔ سونا کیا تھا بس لیٹنا شرط تھا۔

"جاؤ' بھیا۔ اب تم تو لیٹو گے۔ ہم بھی تھوڑی دیر لیٹ جائیں۔" بہار کی والدہ نے کہا۔

جمال اکیلے کمرے' اکیلی چارپائی پر دراز ہوگیا۔ آنکھوں میں نیند تو بہت تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ جب بھی لیٹتا ہے بہار بھی آجاتی ہے۔ پھر دوپہر بھریاتیں ہوتی ہیں لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آج کیا باتیں ہوں گی۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کہ وہ آگئی۔ اس نے کمرے کے پردے درست کیے اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"آپ کو معلوم ہے' میری منگنی ہوگئی تھی؟"

"تمہاری منگنی؟ مجھے تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

"تمہارے یہاں آنے کی خبریں نہ جانے وہاں کس رنگ میں پہنچیں کہ ان لوگوں نے منگنی توڑ دی۔"

"یہ تو بُرا ہوا۔"

"برا نہیں ہوا۔ اگر وہ خود نہیں توڑتے تو میں یہ منگنی توڑ دیتی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہارے سوا کسی سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بمار۔ چندا' تم رو کیوں رہی ہو۔ منگنی میری وجہ سے ٹوٹی ہے نا' میں ہی اس کا ازالہ بھی کروں گا مگر ایک وقت ہے۔"

"بولو جمال بولو۔ میں تمہاری ہر مشکل کو آسان کرنے کے لیے ہی تو پیدا ہوئی ہوں۔"

"میں شاعر کیسا ہی سہی لیکن بہت بڑا غیرذمے دار آدمی ہوں۔ تم مجھے برداشت کر سکو گی؟"

"میں تمہارے قدموں کی دُھول بن جاؤں گی۔" اس نے جمال کے پاؤں پر پیشانی رکھ دی۔

"محبت تو خیر ٹھیک ہے لیکن شادی کے بعد گھر چلانا ہوتا ہے۔ میں معمولی سا لائن مین ہوں۔"

"ہمیشہ یہی نہیں رہو گے اور اگر یہی رہے تو بھی میں گلہ نہیں کروں گی۔ میں تم سے گلہ کر بھی نہیں سکتی۔ میں تمہارے سانس لینے سے زندہ ہوں۔"

"تمہارے رشتے دار اعتراض کر سکتے ہیں۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"پھر تم مناسب وقت کا انتظار کرو۔ مجھے گھر والوں سے بھی تو بات کرنی ہوگی۔ میرے بڑے بھائی ملک سے باہر ہیں۔ ان کے آنے کا انتظار کروں گا۔"

"جمال' تم کتنے اچھے ہو۔" اس نے خوش ہو کر جمال کا ہاتھ چُوم لیا۔

○☆○

ہم دونوں اس شاعرہ کے گھر بیٹھے ہوئے تھے کہ شاہد الوری آ گئے۔ ہماری تو روح فنا ہو گئی کہ شاہد بھائی یقیناً ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔ ہم کسی مناسب جگہ نہیں ملے ہیں' وہ ناراض تو ضرور ہوں گے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ انہوں نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم مل گئے۔

"اچھا ہوا تم لوگ بھی یہیں مل گئے۔ کیپٹن عشرت کا خط آیا تھا' تم چاروں کو کوئٹہ کے مشاعرے میں چلنا ہے۔"

اس سے پہلے وہ ہمیں اندرونِ سندھ کے کئی مشاعروں میں لے جا چکے تھے۔ اس مرتبہ کوئٹہ لے جا رہے تھے۔

"شاہد بھائی' بائی ائر جائیں گے نا؟"

"ہرگز نہیں۔ بائی ائر صرف تین اساتذہ جائیں گے۔ شکیل نشتر' استاد آرزو اکبر آبادی اور میں۔"

"اساتذہ تو پھر وہی ہوئے۔" جمال نے کہا۔

"چل بھائی' تو مت گن مجھے اساتذہ میں اور جا کے دیکھو کوئٹہ۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شاہد بھائی' میں دراصل شکیل نشتر کو استاد نہیں مانتا اس لیے دو استاد کہہ رہا ہوں۔ آپ تو استادوں کے استاد ہیں۔"

"کتنے مکار مرے تھے تو پیدا ہوا تھا۔" شاہد بھائی نے کہا "بھائی تم لوگ جوان ہو' کوئٹہ تک ٹرین میں جا سکتے ہو۔ جوان تو میں بھی ہوں لیکن مجھے پہلے پہنچنا ہے اس لیے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے جمال کے ہاتھ پر کچھ رقم رکھی جو سفر خرچ تھا' ایک مرتبہ پھر تاکید کی کہ فلاں تاریخ کو پہنچ جائیں اور چلے گئے۔

ہمیں تیاری کرنی تھی۔ اپنی اپنی بیاضیں رکھنی تھیں لہٰذا اسی رات کو ہم کورنگی واپس آ گئے۔ میں اپنے گھر چلا گیا اور جمال اپنے گھر۔

۲۷ء کے اپریل کی کوئی تاریخ تھی کہ ہم کینٹ اسٹیشن سے کوئٹہ جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے۔

کوئٹہ کا سفر اور تھرڈ کلاس کا ڈبّا۔ آدھا راستہ بھی طے نہیں ہوا ہوگا کہ تھک کر چُور ہو گئے۔ جمال کا فطری اضطراب یہاں بھی رنگ لا رہا تھا۔ کچھ دیر تو وہ غزلیں ایک دوسرے کو سناتی گئیں جو کوئٹہ جا کر پڑھنی تھیں اور پھر وہ بے چین ہو گیا۔ ہمارے پاس برتھ بھی کوئی نہیں تھی۔ اس سفر میں جمال ہمارا لیڈر تھا لہٰذا اس کی ہر بات ماننا تھی۔

جب وہ بہت بے چین ہو چکا تو اس نے مشورہ دیا کہ چل کر ڈائننگ کار میں بیٹھتے ہیں۔ اے۔ سی میں بیٹھیں گے۔ کھانے پینے میں کچھ پیسے تو خرچ ہوں گے' سفر تو آرام سے کٹ جائے گا۔ تجویز اتنی معقول اور آرام دہ تھی کہ سب نے پسند کی اور اگلا اسٹیشن آنے کا انتظار کرنے لگے۔

گاڑی رکتے ہی ہم نے اپنے اپنے بیگ کاندھے پر لٹکائے سیٹوں پر بچھی ہوئی میلی کچیلی چادروں کو لپیٹ لپاٹ کر ہاتھوں میں پکڑا اور پہنچ گئے ڈائننگ کار میں۔ یہاں کا صاف ستھرا ماحول' ٹھنڈک کا احساس۔ نہ دُھول نہ مٹی' طبیعت خوش ہی تو ہو گئی۔ اس شاعرہ کے ماتھے پر رکھے ہوئے گاگلز' چمکتی ہوئی لپ اسٹک' شاندار کپڑے یہاں پہنچتے ہی بہار جاں فزا بن گئے۔

"جمال تم جب سوچتے ہو خوب سوچتے ہو۔" اس شاعرہ کے شوہر نے کہا۔

"یہ تو سرگودھا جاتا رہتا ہے نا۔ اسے سفر کا تجربہ ہے۔" میں نے کہا۔

"جمال' تم ہو بہت ذہین۔" شاعرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی "آپ کے ذہن میں یہ ترکیب نہیں آ سکتی تھی۔ ابھی تک گرمی میں سڑ رہے ہوتے۔"

"یہ دنیا بنی ہی عقل مندوں کے لیے ہے اور پھر ہم شاعر ہیں یار۔ ہمیں زیب ہی نہیں دیتا تھا کہ ڈبّے میں بھرے بے وقوفوں کے

ساتھ سفر کریں۔" جمال نے اپنی بات بنتے ہوئے دیکھ کر اتراتے ہوئے کہا۔

ویٹر آیا، جمال نے اسے چائے کا آرڈر دے دیا۔ چائے آگئی ہم چائے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔

گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ جمال ہمیں مشاعرے میں کامیاب ہونے کے گُر بتا رہا تھا۔ کوئٹہ کے موسم اور کیپٹن عشرت کے مزاج سے آگاہ کررہا تھا۔

ابھی ہم نے چائے ختم کی تھی کہ ٹکٹ چیکر آگیا "آپ کے پاس ٹکٹ ہیں؟"

"جی بالکل ہیں۔" جمال نے کہا اور چاروں کے ٹکٹ نکال کر اسے پیش کردیے۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہاں صرف فرسٹ کلاس کے مسافر بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ برائے مہربانی اگلے اسٹیشن پر اپنے ڈبے میں چلے جائیں۔"

"جی بہتر۔" جمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

اب جمال چہکنا بھول گیا تھا۔ مارے شرمندگی کے بغلیں جھانک رہا تھا۔

"جمال تمہیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں صرف فرسٹ کلاس کے مسافر بیٹھ سکتے ہیں۔ تم تو کہہ رہے تھے تم نے بہت سفر کیے ہیں۔" اس شاعرہ نے کہا۔

"میں نے تو ایک مرتبہ اسی طرح سفر کیا تھا۔ مجھے تو کسی نے نہیں ٹوکا۔ تم لوگ لگتے ہی نہیں فرسٹ کلاس کے۔"

"اس لیے کہتے ہیں جس معاملے میں معلومات نہ ہو اس میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔" میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا "مروا دیا نا سب کو اب پھر جاؤ واپس۔"

"آپ بکواس کریں بند۔" جمال نے چڑ کر کہا "یہ جو میلی چادریں آپ بغل میں دبا کر لائے تھے، ان کی وجہ سے اسے شک ہوا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے پاس ایسی چادریں نہیں ہوتیں۔"

"تو انہیں کیا وہیں چھوڑ آتا۔"

"بیگ میں چھپا لیتے لیکن اتنی عقل کہاں سے لاتے۔"

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ ڈبے تک پہنچنے کی فکر کرو۔" میں نے کہا۔

"گاڑی رکتے ہی تیزی سے بھاگنا ہے۔ کیا خبر گاڑی کتنی دیر رکے۔"

کچھ دیر پہلے تعریفوں کے پُل بندھے ہوئے تھے یا اب ہر طرف سے جھاڑ پڑ رہی تھی۔ وہ خود بھی ہنس رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار جیسے ہی کم ہوئی اور اندازہ ہوا کہ اسٹیشن آنے والا ہے، ہم نے سامان سمیٹا اور دروازے سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔ گاڑی رکتے ہی ہم پلیٹ فارم پر اترے اور اپنے ڈبے کی

نذرِ جمال

پھولوں سے لدا ہوا تھا بستر اس کا
خوشبو سے مہک رہا تھا پیکر اس کا
دوشیزۂ غزل کی مہرباں تھی اس پر
کانٹوں میں الجھ گیا مقدر اس کا

○☆○

وارفتۂ گفتار سے باتیں کر لیں
شائستۂ اظہار سے باتیں کر لیں
جب کوئی غزل خوب کے پڑھ لی اس کی
اس یارِ طرح دار سے باتیں کر لیں

ڈاکٹر ساجد امجد

طرف بھاگنا شروع کردیا۔ سب سے آگے جمال تھا۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ ہم اپنا ڈبا بھول گئے۔ ہم سب جمال کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ کبھی ایک طرف بھاگتا کبھی دوسری طرف۔ اس شاعرہ کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ایک زنجیر تھی کہ دیوانے کے ساتھ ٹھوکریں کھا رہی تھی۔

"اس سے پہلے کہ گاڑی روانہ ہوجائے کسی بھی ڈبے میں چڑھ جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

بات جمال کی سمجھ میں آگئی۔ اب جو اس نظر سے دیکھا تو معلوم ہوا لوگوں نے دروازے بند کیے ہوئے ہیں۔ دروازے کھلے بھی ہیں تو پائیدان تک لوگ بھرے ہوئے ہیں۔

گاڑی نے سیٹی دی اور ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب ایک ہی راستہ تھا۔ میں نے اور جمال نے اس شاعرہ کو گود میں اٹھایا اس کے شوہر نے بھی ہاتھ لگایا اور کھڑکی کے راستے اسے اندر اتار دیا۔ گاڑی نے رینگنا شروع کیا اور ہم کسی نہ کسی طرح دروازے پر لٹک گئے۔

بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے اندر پہنچے۔ اس شاعرہ کی وجہ سے لوگوں نے کچھ مہربانی کی اور فرش پر تھوڑی سی جگہ دے دی۔ وہی میلی کچیلی چادریں کام آئیں۔ انہیں زمین پر بچھایا اور بیٹھ گئے۔ اس شاعرہ کے ماتھے پر دھرے ہوئے گاگلز اب مجھے زہر لگ رہے تھے۔

"اس ڈبے میں کم از کم سیٹ تو ملی ہوئی تھی۔" شاعرہ نے کہا۔

"پوری کی طرف بھاگے، آدھی سے بھی گئے۔" میں نے کہا۔

اس مرتبہ جمال نے کوئی جواب نہیں دیا، بس ہنستا رہا۔

کچھ دیر بعد صرف جمال نہیں، ہم سب ہنس رہے تھے۔ کسی کی عقل مندی پر نہیں، اپنی بے وقوفی پر۔

اسٹیشن پر اسٹیشن آتے رہے' سفر کٹتا رہا۔ خواری تو بہت ہوئی لیکن اس شاعرہ کی بدولت کچھ دل بہلتا رہا۔ دل بھی کہاں تک بہلاتے۔ کمر اکڑ گئی.... اور بالآخر کوئٹہ آگیا۔

کیپٹن عشرت چھاؤنی میں رہتے تھے۔ جمال کے پاس پتا محفوظ تھا۔ پتا نہ بھی ہوتا تو بھی ہم سے یہی کہا گیا تھا کہ چھاؤنی پہنچ کر کیپٹن عشرت کا نام لے دو گے تو کوئی بھی بتا دے گا بلکہ رکشا والا خود پہنچا دے گا۔

اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیپٹن نے ہمارے استقبال کے لیے ایک مقامی شاعر کو بھیج دیا تھا۔

"آپ لوگ مشاعرے میں آئے ہیں۔" ایک آدمی نے ہمارے پاس آکر پوچھا۔

"جی ہاں۔ کیپٹن عشرت کے مشاعرے میں۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"بڑی مہربانی۔ ہم اکیلے جانے سے بچ گئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ کوئٹہ آئیں اور پتا ڈھونڈتے پھریں۔"

اس نے دو رکشا کیے اور ہمیں لے کر کیپٹن عشرت کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ چھاؤنیوں میں جس طرح کے ہر کس نما بنگلے ہوتے ہیں' یہ اسی طرز کا تھا۔ ان کا اردلی ہمیں اندر لے گیا۔

کیپٹن عشرت سے ملاقات ہوئی۔ اللہ ہماری جانوں کی حفاظت کرے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ دھویں کا بنا ہوا ایک دیو تھا جو ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ لگتا تھا آدم بو' آدم بو کے گا اور ہماری گردنیں دبوچ لے گا۔ قد تو ہم سے کم تھا لیکن بدن پر گوشت بہت تھا۔ چہرہ بہت چوڑا تھا جس پر اتنا زیادہ گوشت تھا کہ آنکھیں چھپ گئی تھیں۔ نہ جانے وہ دیکھ کہاں سے رہے تھے۔ تیل سے چپڑے ہوئے بال جو بہت بڑے سر پر بہت کم تھے۔ ہمیں دیکھ کر ہنسے تو کچھ جان میں جان آئی۔

شاہد بھائی پہنچ چکے تھے۔ معلوم ہوا اپنی بیگم کے ساتھ آئے ہیں۔ اندر گئے تو ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔

رات کو مشاعرہ تھا اور تھکے ہوئے تھے۔ ہم نے غسل کیا اور پڑ کر سو گئے تاکہ رات تک تازہ دم ہو جائیں۔

خیال تھا کہ شام کو گھومنے نکلیں گے لیکن تھکن ایسی تھی کہ سو کر اٹھے تو بس اتنا وقت تھا کہ مشاعرے کی تیاری کر سکیں۔

شام کو کچھ دیر کے لیے کیپٹن کے ساتھ بیٹھنا پڑا تو ہمارا پہلا تاثر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ایک معصوم' گل تھوتھنا سا بچہ تھا جو ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی بے ریا ہنسی' معصوم قہقہے' بھولی بھالی باتیں۔ کوئی انسان اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔

وہ خود بھی شاعر تھے لیکن شاعر ہونے کے باوجود شاعرانہ رقابت سے عاری ہماری خدمت میں سرگرم تھے۔ نوکر کے ہوتے کے باوجود کسی کو تولیا پیش کر رہے ہیں' کسی کو جوتے اٹھا کر دے رہے ہیں۔

تھوڑی دیر میں ایسی بے تکلفی ہو گئی کہ ہم کیپٹن صاحب سے کیپٹن اور پھر عشرت پر اتر آئے۔

شاہد بھائی کی بیگم کو مشاعرے سے تو کوئی غرض تھی نہیں لہٰذا انہوں نے ان کو کسی عزیز کے گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ یہ گھر تو مردانہ بنا ہوا تھا۔

کوئٹہ میں مشاعرے رات گئے تک نہیں چلتے۔ تقریباً گیارہ بجے مشاعرہ ختم ہو گیا۔

ہمارے علاوہ بھی اس مشاعرے میں کراچی کے چند شعرا شریک تھے جن میں اختر فیروز' ارشاد الحق قدوسی بھی تھے۔

مشاعرے کے بعد شعرا کو ٹھہرانے کا مسئلہ تھا۔ مشہور شاعر اور صحافی امداد نظامی اس مشاعرے میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ کراچی سے آئی ہوئی یہ شاعرہ مردوں کے ساتھ کہاں ٹھہریں گی' انہیں میں اپنے گھر میں ٹھہرا لیتا ہوں۔ کچھ شعرا عشرت صاحب کے مہمان ہو جائیں' چند شعرا کو ایک مقامی شاعر نے اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی جن میں ہم بھی تھے۔

"اس شاعرہ" کو امداد نظامی اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ ہم کسی اور صاحب کی قسمت میں لکھے گئے۔ ہم ان صاحب کے گھر پہنچے اور مردانہ دیکھا تو ہمیں تشویش ہوئی۔ اس شاعرہ کو امداد نظامی کے گھر بھیجنے کی بات ہمارے سامنے نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں تو یہاں آکر پتا چلا تھا۔ میں نے تو جمال سے کہا بھی کہ گئی تو گئی لیکن اسے امداد نظامی پر غصہ تھا۔ یہ کیا ہم سے بڑا شاعر ہے۔ تو پھر اس کے شوہر سے بات کرو۔

"یار تمہاری بیوی کہیں اور ٹھہری ہے' تم کہیں اور۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

"اسے امداد نظامی لے گئے ہیں۔ اپنی کراچی کے ہیں دوست ہیں ہمارے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں باتیں بن رہی ہیں۔ امداد نظامی کو لوگ ٹھیک آدمی نہیں سمجھتے۔" جمال نے کہا۔

"پھر کیا کریں۔"

"کرنا کیا ہے۔ ابھی چلو' لے کر آتے ہیں۔"

ہم نے اسے ساتھ لیا۔ باہر نکل کر یاد آیا کہ امداد نظامی کا گھر کیسے ڈھونڈیں گے۔ ہم نے ایک مقامی شاعر کو ساتھ لیا اور رکشا میں لاکر امداد نظامی کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں تو سونے کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ وہ بے چارہ ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"خیر تو ہے جمال صاحب' ساجد صاحب کیا بات ہے۔"

"ہم تک تو خیریت ہے مگر ان صاحب کا اپنی بیگم کے بغیر دل نہیں لگ رہا ہے۔ جاتے ہی شور مچا دیا کہ انہیں لیتے چلو۔ اس لیے

براڈکاسٹ

زیڈ اے بخاری نے' جن دنوں وہ بمبئی ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے' کا اپنی سرگزشت میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ مہاراجا میسور کے بھائی کا ہے۔ لکھتے ہیں "مجھے ایک فون ملا کہ مہاراجا اودھی راج میسور مجھ سے براڈکاسٹ کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔ میسور بہت بڑی ریاست تھی۔ اس سلسلے میں بڑا اہتمام کیا گیا۔ عملہ ہندوستھا' اسٹوڈیو کے انتظام میں منہمک ہوگیا۔

پانچ بجے اودھی راج کی سواری آئی۔ آگے آگے مہاراجا' پیچھے ان کی صاحب زادیاں۔ مہاراجا شراب کے نشے میں جھوم رہے تھے۔ پاؤں کہیں رکھتے تھے اور پڑتے کہیں تھے۔

مہاراجا کو سہارا دے کر اسٹوڈیو لے جایا گیا۔ مہاراجا کے سکتّر نے فرمایا "مہاراجا کل ولایت جارہے ہیں۔ وہ تقریر براڈ کاسٹ فرمائیں گے اور صاحب زادیاں پیانو بجائیں گی اور ابھی۔"

بخاری صاحب لکھتے ہیں۔ "میں گھبرایا مگر سنبھل کر بولا "بمبئی کے وزیر اعلیٰ تشریف لانے والے ہیں....." یہ سنتے ہی مہاراجا کو جوش آگیا' بولے "فوراً براڈ کاسٹ شروع کرو" میں نے جھوٹ موٹ کل پرزے چلانے کے بعد اسٹوڈیو کی سرخ بتی جلوادی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کے سب کو خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد ٹمطراق سے مہاراجا کے نام کا اعلان کیا۔ مہاراجا نے تقریر کا آغاز کیا۔ مگر سنتا کون تھا۔ مہاراجا سمجھ رہے تھے کہ وہ جو ارشاد فرمارہے ہیں' چار دانگ سنائی دے رہا ہے۔ تقریر میں انہوں نے کہا "ہم جارہے ہیں۔" کبھی انگلستان والوں سے کہا "ہم آرہے ہیں" کبھی کھیر صاحب سے کہا "ہم آپ کا انتظار کررہے ہیں" وغیرہ۔

اس کے بعد ان کی صاحب زادیوں نے پیانو بجایا۔ بجایا کیا توڑا۔"

زیڈ اے بخاری کی "سرگزشت" سے ایک اقتباس

○☆○

ہمیں آنا پڑا۔" جمال نے کہا۔

"آپ لوگ تو خواہ مخواہ پریشان ہوگئے۔ وہ یہاں بہت آرام سے ہیں۔ میری بیگم ہیں ان کے پاس بلکہ اب تک تو سو بھی گئی ہوں گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگران کا کیا کریں۔"

"انہیں بلادیں۔ ہم لوگ ایک ہی جگہ ٹھہریں گے۔" اس کے شوہر نے کہا۔

"مرضی آپ کی۔ میں ابھی بلائے دیتا ہوں۔"

تھوڑی دیر میں وہ شاعرہ ہنسی مسکراتی آگئی۔ ہم نے امدادنظامی سے ہاتھ ملایا اور رکشا میں لد کر آگئے۔ یہاں مردانہ ہی مردانہ تھا۔ زمین پر بستر لگا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک کونے میں اپنے شوہر کے ساتھ لیٹ گئی۔

جمال کو اپنی جیت کا نشہ صبح تک تھا۔ ایسا خوش ہوتا پھر رہا تھا جیسے شیر کے منہ سے شکار چھین کر لے آیا۔

صبح کا ناشتا ایک جگہ تھا۔ دوپہر کا کھانا دوسری جگہ۔ رات کا کھانا کہیں اور۔ ہر کھانے اور ناشتے کے بعد ہمیں شعر بھی پڑھنے پڑ رہے تھے۔

دوسرے دن رات کا کھانا جہاں تھا' وہاں ہمیں رکنا بھی پڑگیا کیونکہ چھاؤنی دور تھی اور صبح جس گھر میں ہمیں ناشتے کی شعری نشست میں شریک ہونا تھا وہ گھر اس گھر سے قریب تھا۔ وہ شاعرہ یہاں بھی ہمارے ساتھ تھی۔

جمال کی سیمابی طبیعت نے پھر ایک مصیبت میں ڈال دیا۔ سگریٹ اس کے پاس بھی ختم ہوگئے' میرے پاس بھی۔ اگر میزبانوں سے کہتے تو وہ انتظام کرسکتے تھے لیکن جمال بضد تھا کہ باہر چلو۔

"ابے گھوم بھی آئیں گے اور سگریٹ بھی لیتے آئیں گے۔"

"باہر سردی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"کوٹ پہن لو۔ مجھے تو سردی نہیں لگ رہی ہے۔"

"کیا وحشت ہے۔ بغیر سگریٹ کے کیا مرجاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"اب اٹھ بھی جا' نخرے مت دکھا۔"

میں بے دلی سے اٹھا' کوٹ پہنا اور اس کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ کسی نے روکا بھی نہیں کہ ہم رک جاتے۔

رات زیادہ تو نہیں ہوئی تھی لیکن ہم یہ بھول گئے تھے کہ یہ کراچی نہیں کوئٹہ ہے۔ گلی سے نکل کر سڑک پر آئے تو اندھیرا گھپ پڑا تھا۔ کوئی دکان نہیں کھلی تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا لیکن

سردی ہو رہی تھی۔ میں نے تو خیر کوٹ پہن لیا تھا لیکن وہ سلیپنگ سوٹ میں نکل آیا تھا۔

"استاد واپس چلو۔ سب دکانیں بند پڑی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی دکان تو کھلی ہوگی۔ ذرا آگے چل کر دیکھتے ہیں۔" جمال نے کہا۔

"واپسی میں کہیں گھر کا راستہ ہی نہ بھول جائیں۔"

"نہیں بھولتے۔ میں نے نشان دیکھ لی ہے۔"

ہم دونوں آگے بڑھتے رہے۔ کوئی دکان نہیں کھلی تھی۔ اب جمال مایوس ہونے لگا تھا لیکن اچانک دو پولیس والے ہمیں نظر آ گئے۔

"یہاں کہیں سگریٹ مل جائیں گے۔" جمال نے ان سے پوچھا۔

"اتنا رات کو تم کو سگریٹ کدر ملے گا۔ بازار بند پڑا ہے۔"

"اچھا یہ بتا دو، اسٹیشن کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔" جمال نے پوچھا۔

جمال نے یہ سوچ کر اسٹیشن کا راستہ پوچھا تھا کہ وہاں تو سگریٹ مل ہی جائیں گے لیکن یہ سننا تھا کہ ایک پولیس والے نے میری کلائی پکڑلی ایک نے جمال کی۔

"تم ہندو ہے۔" ایک پولیس والے نے جمال سے کہا۔

"تم بنگالی ہے۔" دوسرے نے مجھ سے کہا۔

میں پاجامے پر کوٹ پہنے تھا اس لیے اس نے مجھے بنگالی تصور کیا۔ جمال پیلے رنگ کا سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس لیے وہ اسے ہندو سمجھے ہوں گے۔

اس زمانے میں مقامی لوگ بنگالیوں کو سرحد پار کرا رہے تھے۔ وہ یہی سمجھے کہ یہ ہندو اس بنگالی کو یا تو کہیں سے لایا ہے یا کہیں لے جا رہا ہے۔

"خاں صاحب، میں ہندو نہیں ہوں۔ قسم سے میں مسلمان ہوں۔" جمال گڑگڑایا۔

"تم ہندو ہے۔" اس نے پھر کہا اور ہمیں لے کر چلنے لگا۔

جمال مستقل انکار کر رہا تھا اور وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا، تم ہندو ہے۔

جب جمال مستقل اپنے مسلمان ہونے پر اصرار کرتا رہا تو وہ پولیس والے ایک جگہ رک گئے۔

"خو کلمہ پڑھو۔"

شامتِ اعمال، غضب یہ ہوا کہ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے جمال کلمہ بھول گیا۔ کبھی بسم اللہ کہتا تھا کبھی الحمد۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔

اب اس پولیس والے نے کلائی چھوڑ کر اسے گردن سے پکڑلیا۔

"کلمہ نہیں آتا۔ کہتا ہے مسلمان ہے۔ تم ہندو ہے۔"

اب بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ ہمیں تھانے لے جا رہے تھے۔

خدا کی پناہ! اتنے چوکی دار دنیا میں نہیں ہوں گے جتنے کوئٹہ میں دیکھے۔ ہر ہر قدم پر ایک چوکی دار ملتا تھا۔ وہ اپنی زبان میں ہمارا تعارف کراتا تھا۔ کوئی لالٹین لہرا کر ہمارے چہرے دیکھتا تھا کوئی ٹارچ کی روشنی میں ہمارا دیدار کر رہا تھا۔ پولیس والوں نے تو جیسے گانا بنا لیا تھا۔ تم ہندو ہے۔ تم بنگالی ہے۔

ایک جگہ پہنچ کر اچانک جمال کو کلمہ یاد آ گیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

"خان صاحب یاد آ گیا۔" جمال نے فر فر کلمہ سنا دیا لیکن اس مرتبہ اس پولیس والے نے کلمے کی سفارش بھی نہیں مانی۔

"تھانے چلو۔ اُدھر سنانا کلمہ۔"

تھانہ بھی نہ معلوم شہر کے کس کونے پر تھا۔ پورا کوئٹہ شہر گھما ڈالا، تمام چوکی داروں سے ملوا دیا تب جا کر تھانہ آیا۔ نیند میں ڈوبے ہوئے تھانے میں ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی۔ ہم اندر پہنچے تو ایک آدمی کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ پولیس والوں نے ہمیں بنچ پر بٹھا دیا۔

"صاحب سو رہے ہیں۔ صبح انھیں گے تو بیان ہوگا۔"

"خان صاحب، صبح تک تو ہم مر جائیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنی سردی ہو رہی ہے۔"

"ابھی ہم کیا کرے۔ صاحب تو سو رہا ہے۔"

"انہیں اٹھاؤ تو۔"

"تم خود اٹھاؤ۔ ہمارا صاحب ہے کہ ہم کو ڈانٹے گا۔"

میں تو مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا لیکن جمال نے ہمت کی۔ اس کے قریب گیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر کو ہلایا۔ اس نے کروٹ بدل لی۔ جمال دوسری طرف پہنچ گیا۔ جمال نے پھر اس کا سر ہلایا۔ وہ پھر سیدھا ہو گیا۔

"اٹھتے تو۔" جمال نے کہا "آپ کے سپاہی ہمیں غلط پکڑ کر لے آئے ہیں۔"

"ابھی آرام کرو، صبح دیکھا جائے گا۔" کمبل کے اندر ہی سے اس نے کہا۔

"خان صاحب آپ انھیں تو۔"

اس مرتبہ اس آدمی نے کمبل ہٹائے بغیر اپنے آدمیوں سے اپنی زبان میں کچھ پوچھا۔ انہوں نے جواب میں جو کہا، ہندو اور بنگالی ہماری سمجھ میں آیا۔

"خان صاحب، ہم ہندو نہیں ہیں۔ ہم تو شاعر ہیں۔ مشاعرے میں آئے ہیں۔ آپ نے ہماری تصویریں بھی دیکھی ہوں گی۔"

"عبداللہ شاہ، انہیں لاک اپ میں بند کرو۔ میں صبح دیکھوں گا۔ انہیں بھی، ان کے اخبار کو بھی۔" اس نے کہا اور کروٹ بدل

لی۔

"اچھا صاحب!"

ان پولیس والوں نے اتنی مہربانی کی کہ ہمیں بند تو نہیں کیا البتہ بینچ پر بٹھا دیا کہ چاہو تو لیٹ جاؤ' چاہو تو بیٹھے رہو۔ بڑی مصیبت میں جان تھی۔ سردی کے مارے جمال کا برا حال تھا۔ اپنی حالت بھی بس میں ہی جانتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

"کیپٹن عشرت کا نام کیوں نہیں لیتے۔" میں نے چپکے سے کہا۔

"ابے ہاں۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ تازہ دم تھا۔

اس نے ان پولیس والوں کو آواز دی جو ہمیں لے کر آئے تھے اور اب دوبارہ گشت پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

"ہم کیپٹن عشرت کے مہمان ہیں۔"

"کون کیپٹن عشرت۔"

"چھاؤنی میں رہتے ہیں۔ فوج میں کیپٹن ہیں۔"

"مگر تم کو تو ہم نے شہر سے پکڑا ہے۔"

"ہم مہمان ان کے ہیں مگر ان کے ایک دوست کے گھر آئے ہوئے تھے۔ سگریٹ لینے نکلے کہ آپ نے پکڑ لیا۔"

اب وہ پولیس والے گھبرا گئے۔ انہوں نے کمبل میں سوئے ہوئے آدمی کو اٹھایا۔

"صاحب' یہ بولتا ہے کیپٹن عشرت کا مہمان ہے۔"

اس نے کمبل سے منہ باہر نکالا "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا' ہماری نیند بھی خراب کی۔"

"ہم گھبراہٹ میں بتانا بھول گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"انہیں ساتھ لے کر جاؤ۔ کیپٹن صاحب پہچان لے تو ٹھیک ورنہ واپس لاؤ۔"

"اچھا صاحب۔" پولیس والوں نے کہا اور ہمیں لے کر تھانے سے باہر آگئے۔

ہمیں اطمینان تو ہوگیا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ چھاؤنی کتنی دور ہے۔

بھیانک سفر پھر شروع ہوگیا۔ سفر واپسی کا تھا مگر چلنا تو پڑ رہا تھا۔ راستے میں پھر چوکی داروں کی فوج۔ اب قدم قدم پر یہ پوچھا جارہا تھا کہ ان بندوں کا کیا بنا اور انہیں کہاں لے جا رہے ہو۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا تو وہ خود بتا رہے تھے۔

عجیب بے بسی تھی کہ رونا آرہا تھا۔ یہ فکر الگ تھی کہ ہمارے اچانک غائب ہوجانے سے شعرا اور صاحبِ خانہ پر کیا گزر رہی ہوگی۔

چھاؤنی آگئی۔ شکر یہ ہوا کہ ہمیں اندھیرے کے باوجود کیپٹن عشرت کا گھر یاد رہ گیا۔

احاطے میں داخل ہو کر پولیس والے نے آواز لگائی "کیپٹن صاحب۔"

"کون ہے بھائی۔" اندر سے عشرت کی آواز آئی۔

"صاحب آپ کا مہمان لوگ آیا ہے۔"

اب جمال کی بھی ہمت ہوئی۔ اس نے عشرت کی آواز پر آواز لگائی "عشرت بھائی" جمال کی آواز میں ایسا سوز تھا کہ خدا کی پناہ۔

عشرت باہر آیا اور ہم پولیس والوں سے ہٹ کر اس طرح عشرت کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے جیسے بچھڑے ہوئے بچوں کو ماں مل گئی۔ ہم نے جلدی جلدی پوری کہانی عشرت کے گوش گزار کی۔ وہ پولیس والوں پر برس پڑے۔

"جب انہوں نے میرا نام لیا تو تم نے انہیں چھوڑا کیوں نہیں۔"

"صاحب' انہوں نے آپ کا نام نہیں لیا تھا۔ جب لیا تو ہم ان کو ادھر لے آیا۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

پولیس والوں نے سیلوٹ ماری اور واپس چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی عشرت نے ہمیں کمبل میں چھپا دیا اور پھر ہنسی کے بادلوں سے کمرا بھر گیا۔ جتنے شاعر وہاں موجود تھے' سب جاگ رہے تھے۔ جو نہیں جاگ رہے تھے انہیں جگا دیا گیا۔ یہ گانا پھر بجنے لگا "تم ہندو ہے' تم بنگالی ہے۔"

باہر کی سردی سے سرد ہو کر آئے تھے' کچھ دیر کمبل میں بیٹھے تو زندگی بن گئی لیکن جمال کو تو زندگی راس ہی نہیں آتی تھی۔ اب اس نے یہ ضد پکڑ لی کہ وہ وہاں جائے گا جہاں وہ شاعرہ اور دوسرے کئی شعرا ٹھہرے ہوئے تھے۔

"اب کہاں جائے گا یار۔ پڑ کے سوجا' صبح دیکھا جائے گا۔" شاہد الوری نے کہا۔

"نہیں' ہمارا جانا ضروری ہے۔ وہاں سب پریشان ہوں گے۔"

کچھ شعرا نے جمال کی حمایت بھی کی کہ کم از کم تمہارے جانے سے انہیں اطمینان تو ہوجائے گا۔

عشرت کے سوا اس وقت ہمارے ساتھ کون جاسکتا تھا۔ اس اندھیرا بھری رات میں عشرت کے ساتھ ہم پھر نکلے لیکن اس سفر میں عشرت کے قہقہے تھے' چوکی داروں کا ہجوم نہیں تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو رات کے تین بج رہے تھے اور ہماری فکر میں سب جاگ رہے تھے۔

ایک دن مزید کوئٹہ میں رہ کر ہم کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔ شاہد بھائی جہاز سے' ہم ٹرین سے۔

واپسی میں جمال کی اس شاعرہ سے ان بن ہوگئی۔ دونوں کے درمیان بات چیت بند ہوگئی۔ ہم بھی چپ ہوگئے۔ ایک پُراسرار خاموشی سے جھگڑتے ہوئے کراچی تک آگئے۔

جمال نے اس شاعرہ سے ترکِ تعلق کرلیا لیکن کوئٹہ کے قیام

نے مجھے اس سے بہت قریب کردیا۔ میں اب پابندی سے اس کے گھر جارہا تھا۔ جمال سے میرا ملنا کم ہوگیا تھا جبکہ اسے میری شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ اس نے شاہد بھائی سے کہا اور شاہد بھائی نے مجھ سے تاریخ طے کرنے کے لیے کہا۔ فلاں دن اپنے گھر والوں کو لے آؤ تاکہ شادی کی تاریخ طے ہوجائے۔ میں نے ہامی بھرلی۔ میں ان دنوں مستقل اس شاعرہ کے گھر رہنے لگا تھا۔

بس جی میں جانے کیا سمائی کہ تاریخ آئی اور گزر گئی۔ نہ میں گیا نہ اپنے گھر والوں سے ذکر کیا۔

اگلے روز میں اس شاعرہ کے گھر بیٹھا تھا کہ شاہد بھائی آگئے۔ اپنی عادت کے مطابق جتنی دیر بیٹھے ہنستے بولتے رہے۔

"ساجد ذرا میرے ساتھ آنا۔" انہوں نے چلتے ہوئے کہا۔

اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیا کرتا' اٹھا اور ان کے ساتھ گھر سے باہر آگیا۔ باہر آکر معلوم ہوا جمال بھی ان کے ساتھ آیا ہے' گھر میں نہیں آیا تھا۔ ہم ایک ہوٹل میں جاکر بیٹھ گئے۔

"تم آئے نہیں۔ ان کے رشتے دار جمع ہوگئے تھے۔ کتنی بے عزتی اٹھانی پڑی۔ کیوں نہیں آئے تھے۔" شاہد بھائی نے کہا۔

"میں نے شادی کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کیوں۔ پیسوں کا مسئلہ ہے تو خرچ میں اٹھانے کو تیار ہوں۔"

"نہیں' کوئی مسئلہ نہیں۔ بس مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔"

"تو منع کردیتے۔"

"اب منع کررہا ہوں۔" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

بات ختم ہوگئی تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ اٹھ گئے۔ جمال اس دوران میں بالکل خاموش تھا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر وہ پہلی مرتبہ بولا۔

"آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ آج سے میری' تمہاری دوستی ختم۔"

"تم کہتے ہو تو نہیں ملوں گا۔" میں نے کہا اور ہاتھ ملائے بغیر اس شاعرہ کی طرف چل دیا۔

اتنا بڑا واقعہ ہوگیا لیکن نہ دل دکھا نہ دل رویا۔ شاید دل کو یقین ہی نہیں تھا کہ دوستی ختم۔

اس نے یہ فراق اس لیے گوارا کرلیا کہ اس کا تبادلہ ہوگیا تھا۔ وہ ان دنوں حیدر آباد میں تھا اور دل بہلنے کے سامان میرے سوا بھی تھے۔ وہاں صابر وسیم اسے مل گیا تھا' خلش مظفر سے ملاقات ہوگئی۔ الیاس عشقی سے ملاقاتیں رہنے لگیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ استاد اختر انصاری اکبر آبادی نے اسے دریافت کرلیا۔ ریڈیو پر' قمر جمیل کراچی سے پہنچ گئے تھے۔ اختر انصاری اس کے ہم مشروب تھے تو قمر جمیل ادبی بحثوں کے لیے مناسب ترین۔ حیدر آباد کی فضا بھی اس کی ہم خیالی تھی۔ شام ہوتے ہی ہوٹلوں کی رونق عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ سواری کی فکر نہ فاصلوں کے جھنجٹ۔ سکھر' شہداد پور' میرپور خاص کے مشاعروں کے دروازے بھی اس پر کھل گئے تھے۔ مست تھا' مگن تھا' میری جدائی جھیل گیا۔

میں کورنگی بہت دن سے نہیں گیا تھا۔ ایک طرحی مشاعرے کی اطلاع ملی۔ یہ بھی معلوم ہوا' جمال وہاں آئے گا۔ میں نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچ گیا۔ وہ اسٹیج کے لیے بنائے گئے تخت کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں شاہد الوری تھے۔ سب کو معلوم ہوچکا تھا کہ میری اس سے بول چال بند ہوگئی ہے۔ اس لیے سب کی نظریں ہم دونوں پر لگی ہوئی تھیں۔ میں بہت دن بعد کورنگی کے کسی مشاعرے میں آیا تھا اور اس فضا میں۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسٹیج کی دوسری جانب میں بیٹھ گیا۔ عجیب عالم تھا۔ کبھی کبھی ہم دونوں کی نظریں مل جاتی تھیں۔ کبھی وہ آنکھیں چرالیتا تھا' کبھی میں نظریں بچالیتا تھا۔

اس کا نام پکارا گیا۔ وہ آیا۔ اس نے غزل پڑھی اور اپنے حصے کی داد سمیٹ کر اسٹیج سے اتر آیا۔ اس کے فوراً بعد مجھے دعوت مل گئی۔ جب میں اس شعر پر پہنچا اور میں نے جمال کی طرف اشارہ کرکے پڑھا تو میری آواز بھرا گئی۔

بعد تھا جو بچھڑنے پر' ملا تھا یوں کبھی ہم سے
کہ جیسے ٹوٹ کر پیاسا گرے پانی کے برتن پر

ہدف سامنے تھا۔ اس شعر نے عجیب کام کیا۔ قیامت ہی تو مچ گئی۔ اس شعر سے آگے بڑھوں' کوئی تیار ہی نہیں تھا۔ اس شعر کو بار بار پڑھنے کے بعد میں نے باقی شعر پڑھے اور اسٹیج سے اترنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی شاہد بھائی نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

"لے بھائی سگریٹ پی۔" انہوں نے پیکٹ آگے بڑھایا۔

مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ پگھل جائیں گے۔ میں تو جمال کے لیے آیا تھا لیکن اس کا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔ اس کی بے رخی دیکھ کر میں بھی اکھڑ گیا۔ مجھے اس شاعرہ کے گھر شہر واپس آنا تھا لہٰذا غزل پڑھنے کے بعد میں مشاعرے سے نکل گیا۔

ایک دن صدر میں وہ مجھے مل گیا۔ میں نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ بالکل سامنے آگیا۔ کترا کے گزرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ گزر بھی جاتا مگر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں نے مجھے روک لیا۔ یوں مل گئے جیسے جدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک ہوٹل میں لے گیا۔

"یار' مجھے معاف کردے۔" اس نے کہا "شادی تیرا ذاتی معاملہ تھا اور میں نے دوستی ختم کرلی۔"

"دوستی کہاں ختم ہوئی۔ بس کچھ دن کے لیے ہم ملے نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا کم ہے۔ وہ تو خیر گزری کہ میں حیدر آباد چلا گیا ورنہ کورنگی میں رہ کر تو یہ دن کاٹے نہیں کٹتے۔"

پھر وہ حیدر آباد کی باتیں سناتا رہا۔ وہاں سے کچھ نئے لطیفے لایا تھا' وہ سنائے۔ پھر شاعری پر آگیا۔

"کچھ سنایار۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔"

ان دنوں مجھ پر رباعی کہنے کی دُھن سوار ہوئی تھی۔ میں نے کچھ رباعیاں اسے سنائیں۔

"پیارے میں تیرے کس ہُنر کا کب قائل نہیں تھا لیکن آج تو تُو نے دل ہی خوش کر دیا۔"

اتفاق یہ تھا کہ ان دنوں اس نے بھی کچھ رباعیاں کہہ رکھی تھیں۔ اس نے بھی ان چار چار مصرعوں سے میری تواضع کی۔

"یار، اب اس شاعرہ کو چھوڑ اور کورنگی آجا۔ تجھے اپنی ماں کا بھی خیال نہیں آتا؟ میرا بھی خیال نہیں آتا؟ میں جب بھی حیدر آباد سے کورنگی آتا ہوں، یاد صدیقی سے سر پھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔"

"آجاؤں گا۔" میں نے اس سے وعدہ کیا۔

اس کی بات میں کچھ ایسا اثر تھا کہ میں واقعی اس شاعرہ کے گھر سے آگیا۔ ایک دن دفتر جانے کے لیے نکلا اور پھر کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔

جمال کے نہ ہونے سے کورنگی میں دُھول اُڑ رہی تھی۔ کبھی آجاتا تھا، کبھی آ بھی جاتا تو ملاقات کیے بغیر ہی چلا جاتا۔ ہم انجیری ہوٹل پر بیٹھ کر اس کی باتیں کرتے یا اگر اس کا کوئی خط آیا ہوا ہوتا تو اسے پڑھتے ایک بار نہیں بار بار پڑھتے۔

وہ ان خطوں میں اپنی تازہ غزلیں ضرور بھیجتا تھا۔ حیدر آباد میں رہ کر بے گھری کا احساس، بہار سے دوری کا دکھ، سلیم احمد کی تربیت کا اثر۔ ان سب باتوں نے مل کر اس کی شاعری کے جوہر کو بہت نکھار دیا تھا۔ حیدر آباد میں رہ کر اس نے کئی بہترین غزلیں تخلیق کیں۔ ان غزلوں کو پڑھ کر مجھے رشک آنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں ایک شاعر کو اچھا شاعر بنتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

○☆○

وہ بہار کے گھر پر بہت دنوں بعد دستک دے رہا تھا۔ روز کا آنے والا ایک مہینے بعد آیا تھا۔ اس کے قدم اس کے قابو میں نہیں تھے۔ اس نے داڑھی بڑھالی تھی۔ خوش لباس بہت تھا لیکن آج لگتا تھا کئی دن سے کپڑے نہیں بدلے۔

بہار نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی "یہ کیا حالت بنالی ہے جمال۔"

اپنے آگے کسی کو بولنے نہیں دیتا تھا لیکن اس وقت دیوار بنا خاموش کھڑا تھا۔ اس کے آتے ہی گھر قہقہوں سے گونجنے لگتا تھا لیکن آج ویرانی کا سماں پیش کر رہا تھا۔ بہار نے اسے پھر جھنجھوڑا۔

"اپنی امی سے کہو، میری بات مان لیں۔"

"میں کہہ کہہ کر تھک گئی جمال۔"

"تم تو کہتی تھیں، تم مجھے ہر حال میں قبول کرلوگی۔"

"میں غلط کہتی تھی۔" وہ سسکنے لگی "تم اپنے گھر والوں کو تیار کیوں نہیں کرتے۔"

"میں کوشش کرکے تھک گیا۔ میرے خاندان والوں کو دیواریں اٹھانے کا شوق ہے، دیواریں گرانے کا نہیں۔ کوئی نہیں سمجھتا میری بات۔ میں یہی کرسکتا ہوں کہ تمہارے لیے سب کو چھوڑ دوں مگر تمہاری امی مانیں بھی تو۔"

کسی کے پاس اب کہنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔

"میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اتنے اتنے دن میں مت ملا کرو جمال۔ ہم اگر مل نہیں سکتے تو ہمیں بچھڑنا بھی نہیں چاہیے۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح مل تو سکتے ہیں۔"

"میں کوشش کرکے دیکھوں گا مگر وعدہ نہیں کرتا۔"

"تمہیں وعدہ تو کرنا پڑے گا جمال۔"

"مگر یہ داغ تو ہمیشہ دل پر رہے گا۔

مقدروں کی لکیروں سے مات کھاہی گئے
ہم ایک دوسرے کا ہاتھ چُھٹنے والے"

وہاں سے نکل کر وہ سیدھا میرے پاس آیا تھا۔ اپنے بھید کسی پر ظاہر نہ کرنے والا مجھ سے ملتے ہی پھٹ پڑا تھا۔

یہ غم نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک ہو نہ سکے
یہ رنج ہے کہ کوئی درمیان میں بھی نہ تھا

"محبتیں رقابتوں کی ضرب کاری سے ٹوٹتی ہیں لیکن ساجد میرا تو کوئی رقیب بھی نہیں۔ پھر میں بہار سے محروم کیوں ہوں۔" جمال نے کہا۔

اسے بہار کی والدہ سے شکایت تھی جو اس بات پر ڈٹی ہوئی تھیں کہ جمال کے خاندان والے شریک ہوں گے تو یہ شادی ہوسکے گی ورنہ نہیں۔ جمال اپنا گھر تک چھوڑ دینے کو تیار تھا مگر وہ تیار نہیں ہوتی تھیں۔

"میں پریشانیوں سے حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں مگر یہ تو پریشانی ہی دوسری ہے یار۔" اس نے بڑے ملال سے کہا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بڑھیا کو ماننا پڑے گا۔ تو انتظار تو کر۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

"میں کل حیدر آباد واپس جارہا ہوں۔ تجھے خط لکھوں گا لیکن دیکھ، جواب ضرور دینا۔" اس نے کہا میں نے پھر سمجھایا اور وہ چلا گیا۔

کئی دن بعد اس کا خط آیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت بکھر گیا ہے۔ وہ ٹوٹنے والا نہیں تھا لیکن لگ رہا تھا، ٹوٹنے کی تیاری کر رہا ہے۔ تازہ غزل بھیجی تھی۔ اس غزل میں اس کا رنگ شاعری ہی دوسرا تھا۔

جمال اب تو یہی رہ گیا پتا اس کا
بھلی سی شکل تھی اچھا سا نام تھا اس کا

پھر ایک سایہ در و بام پر اتر آیا
دل و نگاہ میں پھر ذکر چھڑ گیا اس کا
کسے خبر تھی کہ یہ دن بھی دیکھنا ہوگا
اب اعتبار بھی دل کو نہیں رہا اس کا
مجھے تباہ کیا اور سب کی نظروں میں
وہ بے قصور رہا یہ کمال تھا اس کا
جمال اس نے تو ٹھانی تھی عمر بھر کے لیے
یہ چار روز میں کیا حال ہوگیا اس کا

اس کے خط آتے رہے۔ کبھی شہداد پور سے، کبھی میرپور خاص سے کبھی لاڑکانہ سے۔ سندھ کی زمین میں ٹیلی فون کے تار بچھاتا پھر رہا تھا۔ جہاں پہنچتا وہاں اس کے شاعر ہونے کی خبر بھی پھیل جاتی۔ وہ ان علاقوں میں مشاعرے پڑھتا پھر رہا تھا۔ وہ ان خطوں میں ان شاعروں سے ملاقاتوں کا احوال لکھتا رہا جو اس کے گواہوں میں شامل ہوتے جارہے تھے۔

حیدر آباد تھا کتنے قدم پر لیکن اس نے تو جیسے نہ آنے کی قسم کھالی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ آب و ہوا اسے خوش آگئی تھی بلکہ وہ بہار سے دور بھاگ رہا تھا۔ اسے بہلانے کی کوشش کررہا تھا۔ مگر مگر گھوم کر بہار کے گھر کا رستہ بھولنے کی مشق کررہا تھا۔

یاد رکھنا ہی محبت میں نہیں ہے سب کچھ
بھول جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے

کوئی دو مہینے بعد وہ اجمیری ہوٹل پر چراغ کی طرح روشن ہوگیا۔ اسی طرح خوش و خرم، خوش لباس جیسے کبھی ہوا کرتا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا ہوا جمال احسانی کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ شائبہ تک نہیں ہورہا تھا کہ اس شخص نے بہار کے غم میں داڑھی بڑھالی تھی۔

"کل انجولی جارہا ہوں بھائی کی طرف۔ سلیم بھائی سے بھی ملوں گا۔ غزلیں بہت جمع ہوگئی ہیں، انہیں سنانی ہیں۔ دو تین دن بعد آؤں گا تو تجھے خوش خبری سناؤں گا۔"

وہ آیا، دل میں دھنک کے رنگ اتار کر چلا گیا۔ خوش خبری کی خبر نے اور بھی مطمئن کردیا کہ وہ اندھیروں میں نہیں اجالوں میں ہے۔

وہ دو دن کا کہہ کر گیا تھا لیکن لوٹ کر نہیں آیا۔ معلوم ہوا انجولی ہی سے حیدر آباد چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد پھر آیا۔ اس نے اپنی انگلی میں پڑی ہوئی سونے کی انگوٹھی میرے سامنے لہرائی۔

"تو نے تو شادی کی نہیں، میں نے منگنی کرلی۔"

"اچھا تو یہ تھی خوش خبری۔ ایسی خبر اور ایک ہفتے بعد۔"

"بھائی نے میرے لیے لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ بڑے بھائی کی بات میں ٹال نہیں سکا۔ پھر میں نے بھی سوچا، بہار کو مایوس ہی کردوں۔ فضول میرے انتظار میں بیٹھی رہتی۔"

"اسے بتادیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا بولی۔"

"بولتی کیا۔ بظاہر تو خوش ہی ہوئی۔" اس نے اداسی سے کہا پھر فوراً ہی کھل اٹھا "ابے یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ ایک ہی اسٹیشن پر رک کر کھڑے ہوجاؤ۔ وہ یاد تو بہت آئے گی مگر مجھے مجنوں بن کر جینا نہیں آتا۔"

وہ لوگ میرے بہت پیار کرنے والے تھے
گزر گئے ہیں جو موسم گزرنے والے تھے

اس نے ظاہر تو یہی کیا تھا کہ اسے اس ملنے بچھڑنے کی پروا بھی نہیں۔ وہ تھا بھی اسی مزاج و اطوار کا لیکن میں اس کی غزلوں میں، اس کے لہجے کی دھوپ چھاؤں میں بہار کا عکس دیکھ رہا تھا۔

میں بجھ تو گیا ہوں پھر بھی مجھ میں
روشن ترے نام کا دیا ہے

وقت رینگتا رہا۔ وہ ویک اینڈ پر کراچی آتا تھا۔ کبھی کورنگی کبھی انجولی میں وقت گزارتا اور چلا جاتا۔

ان غیر ضروری مصروفیات کے باوجود وہ اپنی شناخت سے غافل نہیں تھا۔ وہ رسمی شاعری سے نکل آیا تھا لیکن اپنی آواز کی تلاش میں تھا۔ اپنی انفرادیت کی تلاش میں کوشاں تھا۔ ہر اس آواز کے تعاقب میں تھا جو اس کی آواز میں آواز ملاسکے۔ اس کے بیگ میں کسی نہ کسی شاعر کا مجموعہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ نوکری ایسی تھی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا تھا۔ یہ کتابیں اس کے لیے زادِ سفر تھیں۔ فراق، ناصر کاظمی، ظفر اقبال کو وہ اکثر ساتھ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ آیا تو "مراثی انیس" ساتھ تھی۔

"خیریت تو ہے؟ اب کے محرم میں نوحہ تصنیف مرثیہ پڑھنے کا ارادہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یار، زبان سیکھنی ہے تو انیس کو پڑھنا ضروری ہے۔ بڑا مزہ آرہا ہے آج کل۔"

لفظوں کا وہ بڑا دیوانہ تھا۔ کوئی لفظ کہیں نیا پڑھ لیتا تو اس طرح سناتا پھرتا جیسے کوئی نیا شعر ہوگیا ہو۔ الفاظ کا دروبست اس نے یونہی نہیں سیکھ لیا تھا۔ لفظوں کی تحقیق اور استعمال میں اس کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی نے اتنی محنت کی ہو جتنی وہ کررہا تھا۔ وہ ہر معاملے میں بے صبرا تھا، نہیں تھا تو مطالعے کے معاملے میں۔ جب تک شعر کے معنی دل میں نہ اتار لیتا، گتھی سلجھا نہ لیتا، صفحہ نہیں پلٹتا تھا۔ کوئی نیا لفظ مطالعے میں آتا تو بے چین ہوجاتا تھا کہ کسی طرح شعر میں استعمال کرلے۔

○☆○

وہ کراچی آیا ہوا تھا۔ رات کو کورنگی پہنچا تھا اور دوسرے دن حیدر آباد کے لیے روانہ ہونا تھا۔ رات تک باتیں کرتے رہے اور پھر میں اسی کے گھر سوگیا۔ ان دنوں میں ایم۔ اے کرکے کالج میں

لیکچرار ہوگیا تھا۔ کالج شام کا تھا اس لیے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ صبح جلدی اٹھنا ہے۔

مینار مسجد سے اذان فجر بلند ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ خواب ہی ایسا دیکھا تھا۔ میں نے جمال کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔

"میں نے خواب دیکھا ہے جمال۔"

"کمال ہے یار۔ خواب سنانے کے لیے اٹھا دیا۔" اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

میں نے بھی سوچا کہ واقعی یہ تو زیادتی ہے۔ خواب میرا ہے اسے اٹھا دیا۔ یہ خواب تو اٹھنے کے بعد بھی سنایا جاسکتا ہے۔ میں بھی لیٹ گیا۔ کچھ دیر اس خواب کو ذہن میں دہراتا رہا اور پھر مجھے نیند آگئی۔

آنگن میں دھوپ نے بسیرا کرلیا تھا کہ ہم سو کر اٹھے۔ میں نے خواب کے جگنو پکڑے اور اس کے حوالے کردیے۔

"میں نے خواب میں اسی لڑکی کو دیکھا جس سے شاہد بھائی نے میری بات طے کرائی تھی۔"

وہ ہنسنے لگا "بلی کو تو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آئیں گے۔"

"مذاق مت کرو یار۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں انتظار کرتی رہی اور تم آئے نہیں۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ میں بھی رونے لگا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اسی سے شادی کروں گا۔"

"بیان ہوچکا خواب؟ چل، باہر چل کر کچھ کھا آتے ہیں پھر مجھے حیدر آباد بھی جانا ہے۔"

"بات تو سن۔ مجھے کہیں تو شادی کرنی ہوگی۔ کیوں نہ وہیں کرلوں۔ جن لوگوں نے مجھے اس وقت قبول کیا تھا جب میں کلرک تھا، اب میں لیکچرار ہوں تو پہلا حق ان کا بنتا ہے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا "ادھ بھائی۔ خدا کے لیے۔ تو نے پہلے بھی ایک مرتبہ ذلیل کرایا تھا۔ اب ہمت نہیں ہے۔"

"نہیں جمال۔ اب میں نے پکا ارادہ کرلیا ہے۔ تو ان لوگوں سے جا کر بات کر۔"

"دیکھ ایسا کر۔" اب وہ بھی سنجیدہ تھا "تو اچھی طرح سوچ لے۔ میں حیدر آباد سے ہو آؤں پھر دیکھا جائے گا۔"

"نہیں جمال، جو ہوگا آج ہوگا۔"

"تجھے میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"میں تیار ہوں۔"

"اچھا چھوڑ، پہلے میں خود جا کر بات کرتا ہوں۔"

اس نے مجھے میری سسرال کے قریب ایک ہوٹل میں بٹھایا اور خود بات کرنے چلا گیا۔

اسے باتیں کرنے اور باتیں منوانے کا ہنر آتا تھا۔ لوٹا تو سرخرو لوٹا۔

"بس تمہیں میرے ساتھ چل کر اپنے پچھلے رویے پر معذرت کرنی ہوگی۔ باقی بات میں کر آیا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ میری معذرت قبول ہوئی۔ سلسلہ پھر سے چل نکلا مگر اس مرتبہ شاہد بھائی درمیان نہیں تھے۔

جمال میں زبردست انتظامی صلاحیتیں تھیں۔ اس نے شادی کے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے آزاد کردیا۔ وہ حیدر آباد میں ہوتا تو یاد صدیقی اس کا کردار ادا کرتا۔

شادی کے کچھ دن بعد حیدر آباد میں ایک مشاعرہ نکل آیا۔ جمال وہیں تھا لہٰذا میں ایک پنتھ دو کاج کہتا ہوا حیدر آباد پہنچ گیا۔

جمال کی تو یہاں شان ہی کچھ اور تھی۔ وہی آوارہ گردیاں تھیں وہی ہوٹل بازیاں۔ میری جگہ صابر وسیم اسے مل گیا تھا جو رات رات بھر اسے لیے پھرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اختر انصاری اس کے شیدا تھے۔ وہ ان کے پرچے "نئی قدریں" میں بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

میں اس سے نئی قدریں کے دفتر میں ملا تھا۔ وہ اس وقت استاد کی طرف سے خطوں کے جواب لکھنے میں مصروف تھا اور استاد چھوٹی انگلی میں سگریٹ دبائے دھوئیں کے مرغولے اڑا رہے تھے۔ میرے پہنچنے کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دفتر میں بند رہے۔ اس نے استاد سے اجازت مانگی۔

"آپ یوں نہیں مانیں گے۔ صاف کہئے کہاں جانا ہے۔ لیجئے میں پیش کیے دیتا ہوں۔" استاد نے کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جمال کس طرح مانتا ہے اور وہ کیا چیز لینے پردے کے پیچھے گئے ہیں۔ واپس ہوئے تو ان کے ہاتھ میں بوتل اور دو گلاس تھے۔

"اب تو نہیں جائیں گے آپ؟"

اب میں سمجھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ تشویش بھی ہوئی کہ جمال حیدر آباد میں اکیلا ہے۔ اسے روکنے ٹوکنے والا تو کوئی ہے نہیں۔ استاد کے دفتر میں اگر یہ شغل ہوتا تو بات کبھی کبھی سے کہیں آگے نکل گئی ہوگی۔

"آپ بھی پی سکتے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" استاد نے مجھ سے کہا۔

"استاد میں کہاں پیتا ہوں۔"

"پھر رہنے دیجئے۔ کوئی ضروری بھی نہیں ہے۔"

اختر انصاری بڑے تیور کے آدمی تھے۔ نہایت منہ پھٹ تھے۔ بات نہیں کرتے تھے، حکم دیتے تھے اور بڑے بڑے آدمی سے اسی طرح پیش آتے تھے۔

دوسرے دن استاد نے مجھے اور جمال کو ایک ہوٹل پر کھانے پر مدعو کیا تھا۔

جمال کو مجھ سے کچھ بات کرنی تھی لیکن استاد شام سے سائے کی طرح ساتھ لگے ہوئے تھے اور اب بھی کوئی امید نہیں تھی کہ ساتھ چھوڑیں گے کیونکہ کھانا کھائے بہت دیر ہوگئی تھی لیکن وہ اٹھنے کا نام

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں لے رہے تھے۔ اب ہمال کو الجھن ہونے لگی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا میں کوئی ادبی بحث چھیڑ دوں' استاد خود بخود اٹھ جائیں گے۔ یہ ان کی کمزوری تھی۔

میں مذاق سمجھ رہا تھا لیکن یہی ہوا۔ میں نے کسی مسئلے پر ہمال کی رائے پوچھی۔ اس نے جواب میں کچھ کہا اور میں نے اس سے اختلاف کیا۔ پھر باقاعدہ بحث ہونے لگی۔ استاد کچھ دیر تو اپنے مخصوص اسٹائل میں سگریٹ پیتے رہے اور پہلو بدلتے رہے' پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"آپ بحث فرمائیں اور مجھے اجازت دیں۔"

"بیٹھیں استاد۔ کہاں جائیں گے۔"

"جی نہیں' مجھے اور بھی کام ہیں۔"

"دیکھا تو نے؟"

"ہاں یار' کمال ہو گیا۔"

"ہم اور صابر وسیم اکثر یہی ترکیب استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ یہی نتیجہ نکلتا ہے۔"

"یار' تجھ سے ایک مشورہ لینا ہے۔" ہمال نے کہا "میرا خیال ہے میں نے منگنی کر کے غلطی کی۔"

"ان حالات میں تم اور کیا کرتے۔ جب وہ لوگ تیار ہی نہیں ہیں' تو تم اور کیا کر سکتے تھے۔"

"مجھے انتظار کرنا چاہیے تھا۔ کیا خبر بہار کی امی تیار ہو جاتیں۔ میں نے جلد بازی نہیں کی؟"

"جو ہو گیا اسے ٹھیک سمجھو اور فکر کرنا چھوڑ دو۔ اب تم سے ایک زندگی اور وابستہ ہو گئی ہے۔"

"یار' تو میری خاطر بہار کی ماں سے مل نہیں سکتا؟"

"کیا کروں مل کر۔"

"انہیں سمجھا یار۔ تو اب پروفیسر ہو گیا ہے۔ اچھی تقریر کر سکتا ہے۔ انہیں میری حالت بتا اور کسی طرح انہیں تیار کر لے۔"

اس سے آگے وہ بول نہیں سکا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جو چپکے سے آئے اور آنکھوں ہی میں رہ گئے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کراچی جا کر سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔

میں کراچی آیا تو بہار کی ماں سے ملا ضرور لیکن انہیں قائل نہیں کر سکا۔ میں اتنا اچھا مقرر ثابت نہ ہو سکا جتنا ہمال کو اندازہ تھا۔ معاملہ میرا ہوتا تو ہمال ضرور کامیاب ہو جاتا۔ میں اس کی طرح گفتگو کا بادشاہ نہیں تھا۔

"میں منگنی توڑ رہا ہوں۔" ہمال نے کراچی آتے ہی پہلی بات مجھ سے یہی کی۔

"جانتے ہو تمہارے بھائی کو کتنی اذیت ہو گی اور اس لڑکی کے دل پر کیا گزرے گی جس سے تمہاری منگنی ہوئی ہے۔"

"میں نے ایسی ترکیب سوچی ہے کہ لڑکی والے خود ہی منگنی توڑ دیں گے پھر تو بھائی کو اذیت نہیں ہو گی۔"

وہ ترکیب یہ تھی کہ اس نے لڑکیوں کی کچھ تصویریں یاد کو دے کر اپنی منگیتر کے بھائی کے پاس بھیجا۔ اسکیم کے مطابق اس نے وہاں پہنچ کر خوب شور مچایا۔ ہمال کی آوارگی کے فرضی قصے سنائے اور وہ تصویریں بھی دکھا دیں۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے میری بہن سے بھی وعدے کیے ہیں۔ ہمال کی شادی ہو گی تو میری بہن سے ہو گی ورنہ نہیں ہو سکے گی۔ ہم سات بہن بھائی ہیں' اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

وہ دھمکی دے کر چلا آیا اور ہمال منگنی ٹوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے ہوش تو اس وقت آیا' مایوس تو اس وقت ہوا جب بھائی نے شادی کی تاریخ طے کر کے تیاریاں شروع کر دیں۔

کمال یہ تھا کہ ہمال اس کے بعد بھی بہار کے گھر جاتا رہا۔ بہار اور اس کی ماں اس کی شادی میں شریک بھی ہوئیں۔

اس دھمکی کا بس اتنا اثر ہوا کہ یاد صدیقی' ہمال کی شادی میں اس خوف سے شریک نہ ہو سکا کہ اس کے سالے نے اسے پہچان لیا تو سب مل کر ماریں گے۔

سلیم احمد نے اسے سمجھا دیا تھا کہ تم شاعر ہو' کبھی رات کو دیر سے گھر آؤ گے' کبھی نہیں آؤ گے لہٰذا ابھی سے گریہ کشتن کر لو۔ جس رات اس کی شادی تھی' یار لوگوں نے اسے دو بجے رات تک مصروف رکھا۔ سارے چراغ بجھا کر وہ کمرا عروسی میں پہنچا تو گریہ کشتن ہو چکا تھا۔ شہناز سمجھ گئی تھی کہ اس کی شادی شاعر سے ہو چکی ہے۔ شہناز سیدھی سادی' کم عمر لڑکی تھی' ہمال نے جس طرح چاہا اسی رنگ میں ڈھلتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے شوہر کو محبوب بنا لیا۔ بیوی کی شکل میں ہمال کو ایک عاشق اور مل گیا۔ شہناز کی محبت تابع داری کی حدوں میں داخل ہو گئی' من تو شدم کی منزلوں پر پہنچ گئی۔ وہ تو سادہ ترین تھی جس میں اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں تھا۔ ہمال کے جتنے رنگ تھے سب اس میں اتر آئے اور آہستہ آہستہ پکے ہوتے گئے۔ اس نے پہلے ہی دن اسے بہت بڑا شاعر تسلیم کر لیا۔ ہمال نے بھی اسے شاعر بن کر دکھا دیا۔ نہ دن کی خبر تھی نہ رات کی۔ جب چاہتا گھر سے نکل جاتا' جب چاہتا گھر میں چلا آتا۔ نہ وہ کچھ کہتی نہ اسے خیال آتا۔ شادی کے بعد بھی اس کی روش خاص میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وہ کنیزنی اس کی خدمت میں مصروف تھی۔ وہ اکثر رات کے دو بجے بھی گھر میں داخل ہوتا اور دوست اس کے ساتھ ہوتے تو وہ آتے ہی شہناز کو آواز لگاتا۔ اس کی آواز کی جھنکار ختم ہونے سے پہلے وہ باورچی خانے میں موجود ہوتی۔ اسے معلوم ہوتا کہ اس وقت آئے ہیں تو کھانا ضرور کھائیں گے۔

اس کی مثالی محبت نے چند مہینوں ہی میں ہمال کو خرید لیا۔ یہ نہیں کہ وہ بھی اس سے ویسی ہی محبت کرنے لگا ہو بلکہ یہ ہوا کہ خود کو چھپانے پر مجبور ہو گیا۔ یہ سوچنے لگا کہ اب اس کا دل کیا تو ڑا جائے۔ اس نے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ اب تک خیالوں ہی خیالوں میں کسی اور کے ساتھ ہوتا ہے۔

ہیں جس شجر کے تلے کب اسے خبر کی ہے
کہ ہم پہ چھاؤں کسی دوسرے شجر کی ہے

نیا شریکِ سفر چاہتیں جتاتا رہا
بتالؔ پچھلی محبت کی یاد آتی رہی

ہونٹوں سے ہونٹ مل گئے' دل سے ملا نہ دل
یہ بات بھول جاؤ اگر گھر چلانا ہے

تمام تر ناسازگار حالات کے باوجود شہناز نے اپنی جگہ بنا ہی لی۔ ناسازگار صورتِ حالات کے باوصف بھی خود بنالیتے ہیں جنگل میں شجر اپنی جگہ

کوئی ماں اپنے بچے کی بھی کیا دیکھ بھال کرے گی جو وہ جمال کی کر رہی تھی۔ کانچ کا برتن ہے ٹوٹ نہ جائے۔ پھولوں کی پتیاں بکھر نہ جائیں مٹی کا کھلونا پکے فرش پر نہ گر جائے۔ اس کی بات ٹل نہ جائے۔ اس کی حکم عدولی نہ ہو۔ اسے تھکن نہ لگے۔ وہ خوش رہے' غم کا سایہ نہ پڑے۔ شعر وہ کہتا' پریشان وہ ہوتی کہ وہ کتنی محنت کرتے ہیں۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا تو وہ سمجھ جاتی کہ سر میں تیل ڈال کر مالش کرنا ہے۔ وہ بستر سے پاؤں نیچے لٹکاتا تو چپل پاؤں میں آجاتے۔ وہ غصہ دکھاتا تو وہ دلداری کرتی۔ وہ ڈانٹتا تو وہ مسکراتی۔ ایسی مثالی بیویاں شاعروں کو تو کیا' عام لوگوں کو بھی مشکل ہی سے ملتی ہیں۔

وہ شہناز کی طلسماتی محبت میں گم ہو کر راستہ بھٹک سکتا تھا۔ مروت میں آکر سارے ٹھکانے بھول سکتا تھا۔ آوارگی کے سب بہانے پرانے کر سکتا تھا لیکن اس نے ہر زخم کو تازہ رکھا۔ وہ کہہ کر حملہ کرنے کا عادی تھا۔ اس نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے تمام ہم عصر دیکھتے رہ جائیں گے' وہ اتنا آگے جائے گا۔ اسے جب جگر گوشۂ کورنگی کہا گیا تھا تو اس نے یہی کہا تھا "یہ لوگ مجھے کورنگی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ میں پورے ملک کو فتح کروں گا۔"

شادی کے بعد تو وہ اور بھی مطمئن ہو کر آگے بڑھنے لگا تھا۔ سلیم احمد کے گھر اس کی بیٹھک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اطہر نفیس اور جمال پانی پتی سے ربط ضبط بہت بڑھ گیا تھا۔ احمد جاوید سے مطالعے کا ہنر اور سجاد میر سے بولنے کے گر سیکھ رہا تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی تنقیدی نشستوں سے سلیم احمد کے آشیانے تک پرواز کرتا رہا۔ ہر نشیب کو فراز کرتا رہا۔

اسے یہ شعور تھا کہ حدود کوئی بھی ہوں' ان میں رہ کر انسان محدود ہو جاتا ہے اور وہ محدود ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سلیم احمد کا مرید ضرور تھا لیکن اس نے تو کبھی ایک وقت میں ایک عشق پر گزارہ نہیں کیا' اس مریدی میں کیا محصور ہوتا۔ وہ قمر جمیل سے بھی اسی خلوص سے ملتا رہا' رئیس فروغ سے بھی اور احمد ہمدانی سے بھی۔ یہ تو خیر وہ لوگ تھے جو نظریاتی اختلافات کے باوجود سلیم احمد کے عاشقوں میں تھے' کمال یہ تھا کہ وہ افتخار جالب کے گھر بھی اسی عقیدت سے جاتا تھا۔ وہ اگر سلیم احمد کے اثر سے فراق کا عاشق تھا تو دوسری طرف منیر نیازی اور ظفر اقبال کی شاعری سے بھی اکتساب کر رہا تھا۔

علم و فضل کی محفلوں سے اٹھ کر وہ مشاعرہ باز شاعروں کے گھروں کا رخ بھی کرتا تھا۔ ان ٹھیکے داروں سے بھی ربط ضبط رکھتا تھا جن کے ہاتھوں میں شہر کے مشاعرے ہوتے ہیں۔ وہ سب کو عزیز تھا' سب کے گلے کا ہار تھا۔

اتنی مصروفیات کو نبھانا آسان کام نہیں۔ خاص طور پر اس کے لیے جس کی شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ بہن بھائیوں سے تمام تر محبتوں کے باوجود' اس کے پاس ان کے لیے وقت نہیں تھا۔ بیوی کی خدمت گزاری کا معترف ہونے کے باوجود' وہ صرف اس کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس راہ میں اس نے کتنوں کے دل دکھائے ہوں گے' کتنی کوتاہیاں ہوئی ہوں گی لیکن وہ تو شاعری کے لیے اپنی ساری کشتیاں جلا چکا تھا۔ واپسی کا راستہ ہی اس نے نہیں رکھا تھا۔

زمینِ ساحلِ سخن ترے لیے
میں اپنی ساری کشتیاں جلا چکا

وہ ایسا نادان سپاہی نہیں تھا کہ ہتھیاروں کے بغیر ہی میدان میں اتر آتا۔ اس کی پبلک ریلیشنگ بہت مضبوط تھی لیکن وہ صرف اسی ہنر پر زندہ نہیں تھا۔ وہ اپنے ہتھیاروں سے غافل نہیں تھا۔ اس کی شاعری کی عمر جب تین چار سال سے زیادہ نہیں تھی' وہ ایسی غزل لکھ چکا تھا۔

چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا
یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
جو پہلے روز سے دو آنگنوں میں تھا حائل
وہ فاصلہ تو زمین آسمان میں بھی نہ تھا
یہ غم نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک ہو نہ سکے
یہ رنج ہے کہ کوئی درمیان میں بھی نہ تھا
ہوا نہ جانے کہاں لے گئی وہ تیر کہ جو
نشانے پر بھی نہ تھا اور کمان میں بھی نہ تھا
بتالؔ پہلی شناسائی کا وہ اک لمحہ
اسے بھی یاد نہ تھا' میرے دھیان میں بھی نہ تھا

پہلوان تو اپنے پٹھوں کو صرف داؤ سکھاتا ہے' کشتی مارنا پٹھے کی اپنے محنت پر منحصر ہوتا ہے۔ سلیم احمد نے اسے بتایا تھا کہ ہر لفظ کا ایک خاندان ہوتا ہے۔ اس خاندان سے واقفیت کے بغیر وہ لفظ اگر استعمال کر بھی لیا جائے تو بے روح رہتا ہے۔ جمال نے یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی لہٰذا وہ روایت سے انحراف اس طرح نہ کر سکا جیسا کہ اس کے بعض ہم عصر کر رہے تھے۔ اس نے عصری تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا اس لیے وہ اس طرح کا روایت پرست بھی نہ بن سکا جیسے اس کے بعض دوسرے ہم عصر تھے۔ تازگیِ احساس اور ندرتِ بیان نے اسے اس عصر کا شاعر بنایا اور ساتھ ہی اس عصر سے آگے جانے کے

امکان بھی دھندلے دھندلے سہی، نظر آنے لگے۔

وہ اپنی اس مخصوص آواز کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا تو سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ ایک غزل گو اپنے لیے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

اب وہ اپنی ازدواجی زندگی میں اکیلا نہیں رہا تھا۔ ایک بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔ اس کا خاندان مالی طور پر مستحکم تھا لیکن وہ شاعری کرتا پھر رہا تھا۔ اس کے بھائیوں کو اس کے مستقبل کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی نے اسے بھی آمادہ کرلیا کہ وہ ملک سے باہر جائے اور بیوی، بچے کے لیے کما کر بھیجتا رہے۔ وہ بھی ٹیلی فون کے تار بچھا بچھا کر تھک چکا تھا۔ کسی کمزور لمحے میں تیار ہوگیا۔

۷۶ء کے آخری مہینے میں وہ عمان چلا گیا۔ دو روز مسقط میں ٹھہرا اور دو روز صلالہ میں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن جب صلالہ سے پچاس میل دور ایک پہاڑی علاقے "جبل" میں اس کی پوسٹنگ کی گئی تو اس کی طبیعت ٹھکانے آگئی۔

ہنگاموں اور قہقہوں کا رسیا ایک ویران اور بے رونق جگہ کھڑا تھا۔ پرچون کی دکان تک نظر نہ آتی تھی۔ صرف اس کی تعمیراتی کمپنی میں کام کرنے والے تھے جو ایک دوسرے کو دیکھ کر دل خوش کرلیتے تھے۔ پانی تک صلالہ سے آتا تھا اور احتیاط سے خرچ کرنے کا حکم تھا۔ جب اسے پہلے ہی دن یہ ہدایت ملی کہ اگر وہ کیمپ سے باہر جائے تو اپنی ذمے داری پر جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک ساتھی نے اسے بتایا کہ جب تک یہاں رہو، جان ہتھیلی پر رکھ کر رہنا تو اس نے گھبرا کر اپنی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا۔

اپنی ذمے داری پر وہ کیمپ سے باہر نکلا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مقامی لوگ ابھی تک غاروں میں رہتے ہیں۔ اسلحے سے لیس، خونخوار درندوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر پھر کیمپ میں گھس گیا۔

چھٹی کے دن صلالہ چلا آتا تھا اور دلیپ کمار کی فلم دیکھتا تھا۔ اس کا کوئی ہم زباں صلالہ میں تھا نہ جبل میں۔ وہ غزلیں لکھتا رہا اور خطوں کے ذریعے دوستوں کو بھیجتا رہا۔ بالآخر اس نے بڑی جستجو کے بعد ایک شاعر دریافت کر ہی لیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ انگریز تھا اور انگریزی میں شاعری کرتا تھا۔ یہ شخص اس کا اسٹور انچارج تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستوں میں دو چار انگریزی کے شاعروں کے نام اس کے کانوں میں پڑ گئے تھے، ان کے ذریعے اپنے اسٹور انچارج پر رعب ڈالتا رہا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے کام چلاتا رہا۔ زیادہ تھک گیا تو ہندوستان کے شعرا سے خط و کتابت کرکے ریلیشنگ میں اضافہ کرتا رہا یا پھر سرگودھا، اماں، مصطفےٰ اور شہناز کو یاد کرتا رہا۔ وہ دسمبر میں گیا تھا، فروری ۷۷ء تک بہت پر امید تھا۔ شاعرانہ ترنگ کی رمق بھی نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک خط میں لکھا۔

"غار والیوں سے ملنا تقریباً ناممکن ہے البتہ غاروں سے کچھ ہٹ کے کچھ بچ کے راستہ بنا رہا ہوں۔ کوئی صورت نکل آئی تو لکھوں گا۔"

کوئی صورت نہیں نکل سکی کیونکہ آئندہ کسی خط میں اس نے کسی پری چہرہ کا ذکر نہیں کیا۔ چاند اور ستارے سے گلے مل کر کوئی کتنی دیر رو سکتا ہے۔ وہ شاعر تھا اسے خطّ و خال کی ضرورت تھی۔ وہ اس جان لیوا تنہائی سے گھبرانے لگا۔

غار والیوں سے بچ کر کوئی راستہ تو کیا بنتا، الٹا یہ ہوا کہ رمضان کے روزے گلے پڑ گئے۔

اس کا خط آیا۔

"تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ آج رمضان المبارک کا میرا آٹھواں روزہ ہے مگر رونا یہ ہے کہ میری ان نمازوں صوم و صلوٰۃ کو تم نہیں دیکھ پائے۔ ظاہری بات ہے پاکستان میں تو کیا دیکھو گے۔ تمہیں میں یہ خط فجر کی نماز کے بعد اور دفتر جانے سے پہلے لکھ رہا ہوں۔"

جب تک وہ پاکستان میں تھا، میں اسے مذہب سے غفلت پر ٹوکتا رہتا تھا اور وہ میری مذہب پسندی کا مذاق اُڑاتا رہتا تھا۔ پردیس میں اسے یہ دن بھی دیکھنے پڑے کہ خود روزے رکھے۔

وہ غزل کے شعروں کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ نظم و پابندی اس کی زندگی میں تھی ہی نہیں۔ یہاں کی پابند زندگی اسے کھلنے لگی۔

"اب میں یہاں بس کوئی دم ہی ہوں۔ یار مالی استحکام جائے جہنم میں۔ تو میری طبیعت کو سمجھتا ہے۔ میں نے پیسہ کما بھی لیا تو کیا ہوگا۔ یہی کہ جلد از جلد اسے خرچ کرنے کی فکر میں پریشان پھروں گا۔ کوئی مکان، دکان تو میں بنانے سے رہا البتہ منصوبے بنا سکتا ہوں تو اس کے لیے کسی پیسے ٹکے کی ضرورت نہیں..... میں جب آرہا تھا تو یار تو نے بھی مجھے عقل نہ دی کہ کیوں جارہا ہے۔ لعنت بھیج۔"

(۲۵ جولائی ۷۷ء)

اس سے پہلے خط میں وہ یہ مژدہ سنا ہی چکا تھا۔

"اس بات سے قطع نظر کہ وہاں کے حالات کیا ہیں، میں بہت آسانی سے یہ نوکری چھوڑنے کا رسک لوں گا۔ تم دیکھ لینا، چھوٹی موٹی گردش سے تو میں چکرانے والا ویسے بھی نہیں ہوں۔ آگے اللہ رکھوالا ہے۔"

(جون ۷۷ء)

تابڑتوڑ اسی قسم کے خط آتے رہے اور بالآخر اس نے آخری خط لکھ دیا کہ میں کسی وقت بھی آسکتا ہوں، تم گھر سے غائب مت رہنا۔

۷۷ء کا سال پورا کرکے وہ اس حال میں واپس آگیا کہ وہاں کی نوکری چھوڑ آیا تھا اور یہاں کوئی نوکری نہیں تھی۔

میں ساجد رام پوری سے ساجد امجد تو اس کے سامنے ہی ہو چکا تھا، وہ واپس آیا تو میں کورنگی چھوڑ کر کریم آباد آگیا تھا۔

اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور میں کورنگی جانے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے خود آگیا۔ وہی ایک کندھا جھکا ہوا، سینہ تانے، جھومتا جھامتا ڈن ہل کا پیکٹ اور قیمتی لائٹر ہاتھ میں۔

"لعنت ہے سالے۔ خود یہاں آرام سے بیٹھے ہو اور مجھے بھیج دیا تھا صحرا کی خاک چھاننے کے لیے۔ ابھی تک ریت بھری ہے بالوں

میں۔"

"اچھا ہے نا' مال بنا کر لے آئے ہو گے۔"

"تو بھی کرنے لگا میرے بھائیوں کی طرح باتیں۔ میرا ایک سال چوری ہو گیا تجھے پیسوں کی پڑی ہوئی ہے۔"

"اچھا یہ بتا' بہار سے ملا؟" میں نے پوچھا۔

"گیا تھا اس کی طرف بھی۔ شادی ہو گئی اس کی۔" اس کے لہجے میں سارے جہان کا درد سمٹ آیا۔

خورشیدِ وصال اس کے اُجالے کے لیے ہے
اور ہجر کی شب میرے حوالے کے لیے ہے

"اچھا یہ بتا۔ کیا سوچ کر آیا۔ نوکری چاکری کا کیا کرے گا۔"

"اب کرلیں گے کچھ۔ فی الحال تو میں تجھے لینے آیا ہوں۔ ذرا ٹی وی تک چلتے ہیں۔ جب سے آیا ہوں اس طرف جانا ہی نہیں ہوا۔"

جس بات کا جواب اسے دینا نہیں ہوتا تھا' اسی طرح ٹال جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی کو یوں چٹکیوں میں اُڑا دیتا کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔

وہ بے کار پھر رہا تھا لیکن بے فکر تھا۔ میں کورنگی سے چلا آیا تھا اس لیے ملاقاتیں کم کم ہو رہی تھیں۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ ساجد گھربار والا ہو گیا ہے۔ گھربار والا تو وہ بھی ہو گیا تھا۔ ایک بیٹا علی چھوڑ کر صلالہ گیا تھا' واپس آیا تو دوسرا بیٹا آذر پیدا ہو چکا تھا۔ دو دو بچوں کی ذمے داریاں تھیں لیکن اس کے ماتھے پر شکن بھی نہیں تھی۔ وہ کہہ چکا تھا۔

آوارگی کو چھوڑے زمانہ ہوا مگر
آیا نہیں ابھی ہمیں گھر بار دیکھنا

اسے دکھ تھا تو یہ کہ اس کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ دن رات گھر سے باہر رہ کر اور مشاعرے پڑھ کر اس نقصان کا ازالہ کر رہا تھا۔ صلالہ جانے سے قبل وہ اپنے مجموعۂ کلام کا ڈول ڈال چکا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کی کتاب بھی متاثر ہوئی تھی۔ وہ اب نئے سرے سے تگ و دو میں لگا ہوا تھا کہ اس کی کتاب شائع ہو جائے۔

اگر انسان کو اتنی ہی فرصت مل جائے تو پہاڑوں کو زمیں بوس نہ کردے۔ اس گستاخ کو خدا نے دیکھ کر رکھا ہے۔ روزی روٹی میں ایسا الجھایا ہے کہ دیوانے کو بھی کھانے کو چاہیے ہے۔ کچھ دن بے مہار گھومنے کے بعد اسے بھی روزگار کی فکر ہوئی۔ حالات ایسے تھے کہ اس کے مطلب کی نوکری ملنا مشکل نہیں تو ناممکن ضرور تھا۔ یہ بارِگراں عبید اللہ علیم نے اپنے سر لے لیا۔ جمال بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ ان کے ساتھ ہو لیا۔ اب وہ تھا اور علیم کی باتیں۔ آج میں ان کے ساتھ وہاں گیا تھا' آج یہ کیا' آج وہ کیا۔ یار' وہ بھی بڑے شاعر ہیں۔ کل کا پورا دن شعر سننے اور سنانے میں ضائع کر دیا۔ مجھے تو نظر نہیں آتا کہ کام بنے گا۔

پھر یہ ہوا کہ عبید اللہ علیم اسے یوسف جمال کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت سیکریٹری محکمۂ اطلاعات' سندھ تھے۔ ان کی ادب دوستی اور شاعر نوازی اور رندی ضرب المثل تھی۔ وہ تو دفتر میں بھی عالمِ بالا کی سیر کو نکلے ہوئے بیٹھے تھے۔ عبید اللہ علیم کو دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور ایک نوخیز نووارد سے مل کر حیران بھی۔

"یہ جمال احسانی ہے۔ بہت اچھی غزل لکھتا ہے' تمہارے پاس نوکری کے لیے آیا ہے۔" علیم نے کہا۔

یوسف جمال کا حافظہ بہت قوی تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے نظموں کی نظمیں ایسی روانی اور گھن گرج سے پڑھتے تھے کہ سماں بندھ جائے۔ اس وقت بھی انہوں نے اس صورتِ حال میں کہ ان کا ہم نام ان کے سامنے بیٹھا ہے کسی شاعر کے اشعار اپنے مخصوص لہجے میں سنائے' دو گلوریاں ایک ساتھ دائیں گال میں دبائیں اور چائے کے لیے کہہ دیا۔

"یہ چائے پینے نہیں آیا ہے یوسف جمال۔ اسے نوکری چاہیے۔" علیم نے کہا۔

"آپ کی ایجوکیشن کیا ہے؟"

"بی۔ اے۔" جمال نے کہا۔

ایک شاعر کا انٹرویو اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اس سے غزل سنی جائے۔ اس نے غزل سنائی اور یوسف جمال سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ غزل میں کلاسیکل رویوں کے پرستار تھے۔ جمال کی غزل ان رویوں کی پرستار تھی۔ فرمائش ہوئی' اس نے دوسری غزل شروع کر دی۔

بہت رہا' بڑی عیاریوں کے بعد ہوا
وہ مہربان دل آزاریوں کے بعد ہوا
سفر تھا اور محبت کا تھا سفر درپیش
سو فکر مند میں تیاریوں کے بعد ہوا

یوسف جمال کی بھاری آواز سے کمرا گونجنے لگا۔ جمال ایک مرتبہ شعر پڑھتا تو وہ دو مرتبہ دہراتے اور جب اس نے یہ شعر پڑھا تو اس کا سیاسی پس منظر یاد کر کے ان کی داد نے طوفان کھڑا کر دیا۔

اِک آدمی کی رہائی سے بھی تو ہو جاتا
جو شہر بھر کی گرفتاریوں کے بعد ہوا

دوسری غزل ختم ہوئی تھی کہ اس کی نوکری پکی ہو گئی۔ گریڈ سولہ کی سرکاری ملازمت۔

پھر نہ جانے اس نے کیا چکر چلایا کہ سیکریٹری اطلاعات اس کا یار و دلدار بن گیا۔ افسری' ماتحتی کا فرق پیالوں کی کھنک میں گم ہو گیا۔ وہ بہت اچھی گفتگو کرتے تھے لیکن جمال کی پر لطف باتوں نے ان کے فقروں کو بھی مات دے دی۔ اب ہر جگہ دونوں ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔ اس دوستی کو بڑھانے کے لیے جمال نے بھی احتیاط کے کئی دامن چھوڑ دیے۔ اس کی تو عادت ہی یہ تھی کہ جس کو پسند کرتا' اس کی بہت سی عادتیں اپنا لیتا تھا۔ ان دنوں وہ یوسف جمال کے لہجے میں بولنے کی مشق کرنے لگا تھا۔ لڑکھڑا کر چلنے لگا تھا' نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولنے لگا تھا۔ اکثر شامیں نذرِ جام ہوئیں تو اس کے تیور ہی بدلنے لگے۔ یوسف جمال کی محفلوں میں بیٹھا تو کچھ اور افسرانِ

بالا سے بھی تعلقات استوار ہوئے' پرستاروں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ اس کے شعروں نے مکانوں سے کوٹھیوں تک کا فاصلہ طے کرلیا۔

اخبارات پر سنسر لگا ہوا تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں شامل تھا کہ وہ ایسی تحریروں کی نشان دہی کرے جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہوں۔ یہ پابندی اس پر نہیں تھی لیکن وہ اس پابندی کو خود پر پابندی تصور کرتا تھا اس لیے اس ملازمت سے زیادہ خوش نہیں تھا۔

اس ملازمت میں آنے کے بعد وہ کورنگی چھوڑ کر فیڈرل کیپٹل ایریا میں چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ وہ پھر مجھ سے قریب آگیا لیکن اب اس سے ملنا کارِدارد تھا۔ اوّل تو وہ گھر پر ملتا ہی نہیں تھا' کبھی ملتا بھی تو چھوٹا سا کمرا بہت بڑے لوگوں سے بھرا ہوتا۔ اب کورنگی جیسی آوارگی اس کے بس کی نہیں رہی تھی۔

ایک رات ایک مشاعرے سے واپسی پر وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گیا۔ شہناز کہیں گئی ہوئی تھیں لہٰذا وہ اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔ بہت دن بعد اس کے گھر کی فضا کچھ کورنگی جیسی لگی تھی لیکن تھوڑی دیر میں نقشہ بدل گیا۔ اس نے بیٹ کا گدا اٹھایا اور یوسف جمال کی باقیات اس کے ہاتھ میں آگئی۔

"کل دو تشریف یاں بھی لائے تھے۔ کل یوسف جمال آئے تھے' پیتے رہے۔ جو بچ گئی یہاں چھوڑ گئے۔ پیے گا؟"

"اس وقت کیا تک ہے۔ پی کر سو جاؤ' یہ تو اس کی توہین ہے۔"

"ابے اس کی توہین یہ ہے کہ یہ گھر میں ہو اور کوئی اسے نہ پیے لہٰذا تم سالے دیکھتے رہو۔ اس سے بچتے رہو گے تو اسی طرح کی خراب شاعری کرتے رہو گے جیسی کررہے ہو۔"

آنکھوں میں ڈورے اترے تو اسے بہار یاد آگئی۔ بہت دن بعد اس کے ہونٹوں پر بہار کا نام آیا تھا اور بڑی حسرت سے آیا تھا۔

"یار' وہ اپنا ظفر اقبال کیا اچھا کہہ گیا ہے۔

اپنے گھر میں خوش ہے وہ' یہ دیکھ کر جی خوش ہوا
اس ذرا سی بات پر دل رات بھر تڑپا بھی ہے"

اس نے ظفر اقبال کا شعر پڑھا اور سر جھکا کر آگ کو پانی بنانے میں مصروف ہوگیا۔

جب اس آگ کا مقطع ہوا تو وہ چھلکنے لگا۔

وہ بھی تھا کیا وقت جمال
کوئی کہا کرتا تھا چاند

اس نے آنکھوں سے نشانہ لے کر گلاس میز پر رکھا اور سر تکیے پر رکھ دیا۔ ایک بچہ تھا جسے دودھ کی بوتل نے سلا دیا تھا۔ چہرے پر وہی معصومیت' ہونٹوں پر وہی تبسم۔ آنکھیں بند ہوئیں تو آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو گھبرا کر باہر آگئے۔ جاگتے میں روتے ہوئے اس کی انا مجروح ہوتی' وہ سوتے میں رو رہا تھا۔ دنیا بھر کو ہنسانے والا یہ آدمی ابھی تک کسی کی یاد کو دل میں لیے بیٹھا تھا۔ یہ الگ بات کہ گزرنے' جلنے کے بجائے نئی نئی دوستیوں سے وقت گزاری کرتا رہتا تھا۔ اس کا یہ گوشہ اتنا پُراسرار تھا کہ اس کے قریب آنے والیوں کو بھی اس وقت ہوش آتا تھا جب ان جیسی ایک اور اس کے قریب آکر بیٹھ جاتی تھی۔ پھر وہ اپنی چاہت کا بار امانت کسی اور کے سپرد کردیتا۔

بوجھ سے جھکنے لگی شاخ تو جاکر ہم نے
آشیانے کو کسی اور شجر پر رکھا

اب الیاس شاداں بھی فیڈرل کیپٹل ایریا میں آگیا تھا۔ رحمٰن خاور بھی یہیں رہتے تھے لہٰذا مجھے پھر کورنگی جیسا لطف آنے لگا تھا۔ میں گھر سے نکلتا' شاداں کی طرف چلا جاتا اور پھر اسے ساتھ لے کر جمال کی طرف جا نکلتا۔

الیاس یہاں آتو گیا تھا لیکن جمال کی ملاقاتوں میں اب پہلے جیسی گرمی نہیں رہی تھی۔

"ابے یہ بیکار لوگ ہیں' ان پر وقت مت ضائع کرو۔ کیا فائدہ ان سے ملنے کا۔"

"یاد ہے جمال۔ کبھی تم اس بے کار آدمی سے مجھے ملوانے لے گئے تھے اور کتنی تعریفیں کی تھیں تم نے۔"

"کبھی کی بات چھوڑو یار۔ کبھی تو میں انگوٹھا بھی چوستا تھا۔ تو کیا ساری عمر انگوٹھا چوستے ہوئے گزار دوں؟"

"انسان کو اپنا ماضی نہیں بھولنا چاہیے۔ ایک غریب آدمی جب اتفاق سے بادشاہ بن گیا تھا تو اس نے غریبی کے زمانے کے کپڑے محفوظ کرلیے تھے جنہیں وہ گاہ گاہ دیکھا کرتا تھا۔ جمال یہ لوگ ہماری غریبی کے زمانے کے کپڑے ہیں۔" میں نے اپنی دانست میں اسے قائل کیا۔

"وہ تو بے وقوف تھا۔ میں ہوتا تو اپنے سے بڑے بادشاہ کے کپڑے منگوا کر رکھتا اور انہیں دیکھ دیکھ کر سوچا کرتا کہ کون سا دن ہوگا جب میں یہ کپڑے پہنا کروں گا۔" اس نے اپنے دل کی بات کہی۔ پھر شہناز کو آواز دی "شہناز! ساجد آئے ہیں' چائے پلاؤ یار۔"

اس کا مطلب تھا کہ اب وہ اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتا۔ میں خاموش ہوگیا۔

ایک مرتبہ بہت مجبوری میں وہ میرے ساتھ شاہد الوری کے گھر ایک مشاعرے میں گیا۔ مشاعرے کے بعد ظاہر ہے ہمیں وہیں رکنا پڑا۔ یاد صدیقی مشاعرے میں نہیں آیا تھا اس لیے میری ضد پر وہ اس سے ملنے لانڈھی چلا گیا۔ اجمیری ہوٹل کو دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔

"یار' یہاں بیٹھ کر ایک ایک چائے پئیں۔"

"یاد کے گھر چل کر پئیں گے۔" اس نے کہا۔

"چائے کی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "ایک زمانے میں ہم یہاں کتنا بیٹھے ہیں۔ اک ذرا یادیں تازہ ہوجائیں گی۔"

اس کا دل ذرا بھی نہیں پسیجا۔ مجھے گھسیٹتا ہوا یاد کے گھر لے گیا۔ یاد نے بھی میری طرح یہی کہا۔

"تم لوگ آگئے ہو تو آؤ اجمیری ہوٹل پر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"اب اب وہاں کون جائے۔ یہیں پلا دے یار۔"

نئے جھمیلوں میں پرانی یادیں زیادہ دیر تک اس کے ذہن میں نہیں رہتی تھیں۔ اسی لیے مجھے تعجب ہوتا تھا کہ وہ کبھی کبھی بہار کا ذکر کیوں لے بیٹھتا ہے۔

ایک دن اچانک اس نے انفارمیشن کی نوکری چھوڑ دی۔ نوکری چھوڑنے کے لیے کسی عبیداللہ علیم کو ساتھ لے کر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان دنوں محسن بھوپالی سے اس کی خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ خدانخواستہ وہ اس کی نوکری چھڑوانے میں رہنمائی کر رہے تھے بلکہ وہ ان دنوں اپنی کتاب "ستارۂ سفر" لانے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا اور محسن بھوپالی اس سلسلے میں اس کے بہت کام آسکتے تھے۔ عبیداللہ علیم اب اس کی حد تک پس منظر میں چلے گئے تھے۔

"اب کیا کرو گے؟"

"کرلیں گے کچھ۔ شہناز! ساجد آئے ہیں یار۔ چائے پلاؤ۔"

اب وہ شکیل عادل زادہ کے عشق میں مبتلا تھا۔ سب رنگ ڈائجسٹ کا دفتر خوش باشوں' خوش نوشوں اور خوش خوراکوں کی چوپال بنا ہوا تھا۔ ہمال میں یہ تینوں اوصاف برابر کی مقدار میں موجود تھے لہٰذا اس کا دل یہاں خوب لگا۔ اس لیے بھی بڑا ضروری تھا کہ اس کی کتاب شکیل عادل زادہ کے اشاعتی تجربے کی چھاؤں میں پاؤں پاؤں چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر قدم پر ایک ڈش آڑے آجاتی تھی۔ کبھی قیمہ ہری مرچیں' کبھی کوفتے' کبھی صابری کی نہاری۔

اس کی بے کاری کا عرصہ پھر ختم ہوا۔ اب وہ حریت اخبار میں چلا گیا تھا۔ کالم لکھنے لگا۔ ایک قطعہ روز لکھنے لگا مگر اس طرح کہ ایک قطعہ واقعی دن بھر میں لکھتا تھا۔ ٹھاٹ اس کے وہاں بھی وہی تھے۔ صبح پہنچ کر ایک ایک آدمی سے چھیڑ خانی کرتا۔ کچھ دیر کام کرتا' پھر کھانے کا وقت ہوگیا تو سب اس کی میز پر جمع ہوگئے۔ کھا کم رہا ہے' دوسروں کو تلقین زیادہ کر رہا ہے کہ وہ کھائیں۔ کھانے کی صفات بتا رہا ہے۔ کوئی خاص ڈش موجود ہے تو اس کی تعریفیں کر رہا ہے۔ مختلف علاقوں کی خاص خاص ڈشوں پر سیر حاصل تقریر کر رہا ہے۔ پکانے کی ترکیبیں بتا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ لطیفے بھی سناتا جا رہا ہے۔ جب روٹیاں کم اور بوٹیاں زیادہ کھا چکا تو یہ سلسلہ تھما۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ اس نے زمین پر اخبار بچھائے اور آنکھ جھپکنے کے لیے لیٹ گیا کہ قیلولہ بڑا ضروری ہے۔

یہاں انور مقصود موجود تھے لہٰذا اس کا خوب دل لگا رہا۔ دن بھر لطیفوں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ شام کو سارے لطیفے جیب میں رکھتا اور پورے شہر میں پھیلا دیتا۔

حریت کا دفتر' سب رنگ ڈائجسٹ کے قریب تھا لہٰذا اس کی نشستیں یہاں روز جمنے لگیں۔

میں نے مکان تبدیل کرلیا۔ کریم آباد سے دستگیر چلا گیا۔ وہ ابھی اسی فلیٹ میں تھا۔

ایک وقت وہ آیا کہ سجاد میر بھی حریت میں آگئے۔ اب تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ایک طرف انور مقصود' ایک طرف سجاد میر۔ خوب دل لگا ہوا تھا۔ اخبار کی اشاعت کے اضافے کے لیے نت نئے تجربات کیے جا رہے تھے۔ کچھ دن خوب دھوم دھام سے ایڈیشن نکلتے رہے اور پھر اشاعت پہلے سے بھی کم ہوگئی۔ نقصان بڑھتا گیا۔ مالکان کے ابلاس ہوتے رہے اور بالآخر جمال نے اس نوکری کو بھی خیرباد کہہ دیا۔

اس کی کتاب ستارۂ سفر چھپ چکی تھی۔ اس کتاب کے حوالے سے اس کے ساتھ شامیں منائی جا رہی تھیں۔ تقریبات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس کی محنت سپھل ہوئی۔ میرے لیے بھی یہ لمحے بڑے یادگار تھے۔ میں اس کتاب کی پہلی غزل سے آخری غزل تک تماشائی کی حیثیت سے شریک تھا۔ مجھے معلوم تھا کون سی غزل کس محبوبہ سے بچھڑنے کے بعد تخلیق ہوئی۔

روزگار کی فکر نے پھر اسے پریشان کیا ہوا تھا۔ حریت سے نکلنے کے بعد وہ مستقل بے روزگار تھا۔ اب اس کے اپنے بازو اتنے مضبوط تھے کہ کسی اور سہارے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کون تھا جو اس سے واقف نہیں تھا۔ بس جو دیر لگ رہی تھی' لگ رہی تھی۔

وہ ایک دن صبح ہی صبح میرے گھر آدھمکا۔ میں اوپر کی منزل پر رہتا

وجہ

عطاء الحق قاسمی نے اپنے ایک کالم میں شاعر افتخار عارف کا ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"افتخار ایک بزلہ سنج آدمی ہے۔ زبردست فقرے باز ہے اور اس عالم میں بعض اوقات وہ وضع داری کو بھی ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ چند برس قبل لندن میں مشتاق یوسفی کے فلیٹ میں پاکستان سے آئے مہمانوں کے اعزاز میں ایک محفل برپا تھی۔ ایک ممتاز پاکستانی شاعر بھی موجود تھے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں اپنی بیاض کے گم ہوجانے کا ذکر کیا تو امجد اسلام امجد نے افتخار کو مخاطب کرکے ازراہِ تفنن کہا "تم اپنی بیاض انہیں کیوں نہیں دے دیتے۔"

افتخار نے کہا "دے تو دوں مگر میری بیاض میں تو کچھ اچھے شعر بھی ہیں۔"

○☆○

تھا۔ اس نے گلی میں کھڑے ہو کر آواز دی کہ گلی گونج اٹھی۔ وہ جب بھی آتا تھا' کوشش کرتا تھا کہ آواز دے' بیل نہ بجائے۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہ مجھے نیچے بلا رہا تھا۔

"یار' میں پھر آگیا تیرے پڑوس میں۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"الف لیلہ ڈائجسٹ میں نوکری کرلی ہے۔ جانتا ہے' ایچ اقبال کو۔"

الف لیلہ کی اشاعت بہت گر گئی تھی اور اب اسے سنبھالا دینے کے لیے جمال کو لایا گیا تھا۔ اس کے پاس کئی منصوبے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ان منصوبوں پر بحث ہو رہی تھی۔ بحث کیا ہو رہی تھی' وہ بیان کر رہا تھا اور ایچ اقبال سن رہے تھے۔

شرائط میں طے ہوا تھا کہ مکان کا کرایہ ادارہ دے گا۔ تنخواہ کرائے کے علاوہ ہوگی۔

جمال نے دوسرے ہی دن دفتر کا نقشہ بدل دیا۔ کون سی میز کہاں پڑے گی۔ اقبال صاحب کہاں بیٹھیں گے' چپراسی کہاں بیٹھے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ نئے کاتب ڈھونڈے گئے' نئے رائٹروں کی تلاش ہوئی۔ یہ سب کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس پر بہت کام آن پڑا ہے' اسٹاف کم ہے۔ کچھ اسٹاف نیا آگیا۔ بیشتر رائٹرز کے پاس موضوعات تو ہوتے ہیں' اندازِ بیان ٹھیک نہیں ہوتا لہٰذا کہانیوں کو ری رائٹ ہونا چاہیے۔ اس نے اس کام کے لیے مجھے رکھ لیا۔

جب کام ذرا چل پڑا تو اس مسافر نے فیڈرل کیپٹل ایریا سے سامان اٹھایا اور دستگیر ہی میں رہائش بھی اختیار کرلی تاکہ بقول اس کے' دفتری امور کی دیکھ بھال اچھی طرح ہوسکے۔

کچھ دن گزرے تو اس نے پروف ریڈنگ کے لیے عشرت انجم کو بلالیا۔ لیجیے تین تین شاعر جمع ہوگئے۔

جب وہ تمام کام دوسروں پر تقسیم کرچکا تو دفتر میں بیٹھ کر غزلیں کہنے کے سوا اس کے پاس کوئی کام باقی نہیں بچا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خالی بیٹھ ہی نہیں سکتا لہٰذا اپنے لیے بھی کام نکال لیا۔ کھانا ہوٹل سے آتا ہے' مہنگا بھی پڑتا ہے اور اچھا بھی نہیں ہوتا لہٰذا کھانا دفتر ہی میں پکایا کریں گے۔ اقبال صاحب بھی کچھ کم چٹورے نہیں تھے۔ تجویز انہیں معقول بھی لگی' دلچسپ بھی۔

اب دفتری امور کی دیکھ بھال اس طرح ہونے لگی۔ دفتر نو بجے کھلتا' جمال ساڑھے نو بجے تک پہنچ جاتا۔ اس کے آتے ہی چپراسی چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں چلا جاتا۔ اسٹاف کے لیے چائے آجاتی۔ چائے پینے کے بعد دس بجے تک کام شروع ہوجاتا۔ اتنی دیر میں مچھلی والے کی آواز آتی۔

"اقبال بھائی! مچھلی ہوجائے۔ زندگی بن جائے گی۔" جمال زور سے چیختا۔ پھر چپراسی کو دوڑاتا "دو چار کلو مچھلی پکڑ لے یار۔"

دروازے پر کھڑے ہو کر بھاؤ تاؤ کرتا' مچھلی کٹواتا۔ خود مچھلی دھونے بیٹھ جاتا' چپراسی کو بازار دوڑاتا' تاکہ مچھلی پکانے کے لیے جن لوازم کی ضرورت پڑتی ہے وہ لاسکے۔ مچھلی چڑھانے کے بعد چپراسی کو ضروری ہدایت دیتا اور خود کسی کہانی کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہوجاتا۔

ڈشیں بدلتی رہتیں' معمولات یہی رہتے۔ پرچہ لیٹ ہونے لگتا تو راتوں کو کام کرکے یہ کمی پوری کرلی جاتی۔

یہ شاہ خرچیاں کب تک چلتیں۔ خرچ بڑھتا گیا' آمدنی کم ہوتی چلی گئی۔ ہر مہینے' اگلے مہینے کی توقع پر قرض لیا جاتا رہا۔ نوبت یہ آگئی کہ اسٹاف کی تنخواہ دینے کے لیے پیسے نہ بچتے۔ اقبال بھائی نے اسٹاف پھر اتنا ہی کردیا جتنا جمال کے آنے سے پہلے تھا۔ کام کا دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ جمال پریشان ہوگیا۔ اس دباؤ کے باوجود بھی جب وقت پر تنخواہ نہیں ملی تو جمال نے پچھلی کئی نوکریوں کی طرح یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔

"اب کیا کروگے؟"

"اپنے کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔ ابھی تو تمہارے گھر چل کر کھانا کھائیں گے اور پھر قیلولہ بھی وہیں کریں گے۔"

نوکری چھوڑ کر وہ ایسا خوش ہوتا تھا جیسے کوئی طویل بیماری کے بعد صحت یاب ہوا ہو یا لمبی قید سے رہائی ملی ہو۔ یہ بھی نہیں تھا کہ گھر میں کوئی تنگی نظر آتی ہو۔ اس نے کسی بھی دور میں اپنے گھر کو مالی بحران سے دوچار نہیں ہونے دیا۔ شہناز جو کورنگی کے سو کوارٹر میں بیاہ کر گئی تھی' اس دیوانے کے ساتھ آشیانہ بدل رہی تھی لیکن کسی کسمپرسی کی حالت میں نہیں بلکہ اس طرح جیسے کوئی بادشاہ اپنا دارالخلافہ بدل لیتا ہے۔

الف لیلہ کی نوکری چھوٹی تو اس نے ایک نئے تجربے کی ٹھانی۔ اس مرتبہ نوکری نہیں کرنی ہے۔ پھر کیا کروگے؟ ٹھہر یا' سوچنے دے میں اپنا کوئی کام کروں گا۔

اس کے ہاتھ کسی کا بریف کیس لگ گیا تھا۔ اب وہ اس بریف کیس کے ساتھ نکل جاتا اور رات گئے واپس آجاتا۔

"کیا کرتا پھر رہا ہے میرے یار۔"

"مارکیٹ کا جائزہ لے رہا ہوں یار۔ اس کے بعد ہی تو کچھ سوچوں گا۔ لیکن چھوڑ' تو نہیں سمجھے گا ان باتوں کو۔ بی ایڈ کالج میں مشاعرہ ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے ایک ہزار روپے دو تو آؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے نہیں جاؤ گے۔ اب کون دے گا تمہیں پیسے۔"

"نہ دیں مگر میں نے سوچ لیا ہے' پیسوں کے بغیر مشاعرے میں نہیں جاؤں گا۔"

وہ بہت دن تک مشاعروں میں نظر نہیں آیا۔ کہیں دیکھا گیا تو اس نے یہی بتایا کہ پیسے لیے تھے تو گیا تھا۔

اسے پیسوں کی ضرورت کب نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دل میں ایک آندھی چلتی رہتی تھی جس میں اس کی جیب کے پیسے اُڑتے رہتے تھے۔ ہر تیز جھونکے کے بعد اسے پیسوں کی ضرورت پڑجاتی تھی۔ وہ کسی جاندار کو ہانچنے لگتا تھا اور وہ بے جان سونے کا مجسمہ بن جاتا تھا۔ اس سونے سے وہ اپنی ضرورت پوری کرلیتا تھا۔ ضرورت کیا تھی؟ آج میں نے دوستوں کو کھانے پر مدعو کرلیا ہے۔ انڈیا سے شاعر آئے ہوئے ہیں' ان میں سے ایک سے یاری ہوگئی ہے یار۔ انہیں میں نے اپنے گھر ٹھہرالیا ہے۔ شہناز کو شاپنگ کرنی ہے۔ فلاں رشتے دار کی شادی ہے۔ کھانا میری طرف سے ہوگا۔

"ایسا اسکول بتا جس کی فیس زیادہ ہو۔"

"کیوں؟"

"بچوں کو داخل کرانا ہے۔"

"فیس کی کیا شرط ہے؟"

"فیس زیادہ ہوگی تو وہ اسکول بھی تو کچھ ہوگا یار اور پھر بچوں کو یہ احساس ہمیشہ رہے گا کہ انہوں نے اچھے اسکول میں پڑھا۔ بچوں کی نفسیات پر اچھا اثر پڑتا ہے۔"

لطف یہ ہے کہ اچھے اسکول میں بچوں کو داخل کراتے ہی گھر بدلنے کی نوبت آجاتی اور اسے پھر کسی اچھے اسکول کی فکر لگ جاتی۔

اچھے اسکول گھروں کے قریب تو ہوتے نہیں ہیں۔ یہ اسکول گھر سے دور ہوتے۔ وہی اتنا تھا (بچوں کے معاملے) کہ اسکول دین پر بھروسا ہی نہیں تھا۔ یہ ڈیوٹی شہناز کی ہوتی تھی کہ وہ بچوں کو اسکول لے کر جائے اور پھر لے کر آئے۔

الف لیلہ سے نکلنے کے بعد اس سے ملاقاتیں بہت کم ہو رہی تھیں حالانکہ وہ بھی دہلی میں تھا' میں بھی۔ ایک روز میں اس کے گھر گیا۔ شہناز سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔

"یہ جمال کہاں غائب رہتا ہے۔ کیا کر رہا ہے آج کل؟"

"بزنس کر رہا ہے اپنا۔ لو آپ کو نہیں پتا۔"

"مجھے کچھ بتاتا ہے وہ۔"

"ارے نہیں۔ بے چارے اتنی محنت کر رہے ہیں۔ صبح نکلتے ہیں تو رات ہی کو آتے ہیں۔ وہ بھی ایسے تھکے ہوئے کہ بس۔ کوئی آسان تھوڑی ہے بزنس کرنا۔"

اسی وقت وہ کسی کی گاڑی پر لد کر آگیا۔ اس نے گلی میں کھڑے کھڑے آواز لگائی "شہناز!"

"وہ آگئے۔" شہناز نے کہا اور دیوار سے نیچے جھانکا۔

"چائے مت بنانا۔ نماری لایا ہوں زبردست قسم کی۔"

"اوپر تو آؤ' نیچے ہی سے بولے جا رہے ہو۔"

وہ ابھی آدھا زینہ چڑھا ہوگا کہ اس نے پھر آواز لگائی "شہناز! چائے رکھ دو۔ کھانا ذرا ٹھہر کر کھائیں گے۔"

الفاظ ختم ہوئے تو وہ اوپر آچکا تھا "چل اچھا ہوا' تو بھی آگیا۔ مزہ آجائے گا نماری کا۔" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

اس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں احتراماً کھڑا ہوگیا۔

"دوست ہیں ہماری۔" اس نے ظاہر ہے ان کا کوئی نام بھی بتایا ہوگا۔

"شہناز!" وہ پھر چیخا "ان سے ملو آکر۔ تم سے تو ملنے آئی ہیں اور تم ہی غائب ہو۔"

"آپ تو بولا دیتے ہیں۔ آرہی ہوں۔" وہ ہنستی ہوئی آئی اور ان خاتون کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

ان خاتون کے پاس بیٹھ کر بھی شہناز کے پاس جمال ہی کی باتیں تھیں۔ اتنی محنت کرتے ہیں۔ اتنی صبح نکلتے ہیں۔ رات رات بھر شاعری کرتے ہیں۔

میں نے چائے پی اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا لیکن میں ان کی تنہائی میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"یار' نماری لایا ہوں اور تو جا رہا ہے۔" اس نے زینے پر آکر مجھ سے کہا۔

"تم ان سے باتیں کرو' میں چلا۔"

"ابے لعنت بھیج۔ تجھ سے بڑھ کر تھوڑی ہیں یہ۔"

"پھر بھی۔ اچھا' خدا حافظ۔"

اس وقت تو کوئی موقع نہیں تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا' اس نے وال پینٹ کی ایجنسی لے لی ہے۔ سپلائی بھی کرتا ہے۔ دفاتر اور کارخانوں میں جاکر آرڈر بک کرتا ہے اور پھر ان کی ضرورت کے مطابق پینٹ (PAINT) سپلائی کرتا ہے۔

مجھے تعجب کے سوا کچھ اور نہیں ہوا۔ ایک نازک خیال شاعر اور یہ ٹھیکے داری!

میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ یہ کام اس کے بس کا تھا ہی نہیں۔ بس یہ ہوا کہ اس بہانے کچھ صنعت کاروں سے اس کی دوستی ہوگئی اور "ستارۂ سحر" کے نام پر کچھ اشتہار مزید جمع ہوگئے۔

اب وہ پھر گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہر وقت مل جاتا تھا لہٰذا میں ہر وقت جانے لگا۔

"ہمارے میاں آج کل بہت کام کر رہے ہیں۔" شہناز نے اس کے سر میں مالش کرتے ہوئے کہا۔

"لیٹے لیٹے اگر کچھ کام ہوتے ہیں تو یہ ضرور کر رہے ہوں گے۔"

"واہ' یہ تو اپنی اپنی قابلیت ہے۔ یہ لیٹے لیٹے اتنا کما لیتے ہیں۔"

"کیا بھئی' لیٹے رہنے کے کسی عالمی مقابلے میں شریک ہوگیا ہے' یا کیا چکر ہے۔" میں نے جمال سے کہا اور وہ ہنسنے لگا۔

MAY.98SARGUZASHT

"ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کا کچھ کام مل گیا ہے' وہ کر رہا ہوں' مختلف ادارے اشتہاری مہم چلاتے ہیں۔ ان کے لیے اسکرپٹ لکھ دیتا ہوں اور پیسے کھرے کرلیتا ہوں۔ یار بڑے پیسے ہیں اس کام میں۔ میرے مزاج کے مطابق بھی ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام ہے۔ اب سوچ لیا ہے کہ اِدھر اُدھر نہیں جانا ہے' یہی کرنا ہے۔"

عزائم تو یہ تھے مگر اس بے چین بوٹی کو قرار کہاں تھا۔ عالم تاب تشنہ سے خلا ملا ہوا اور وہ اپنے ادارے "عالم گروپ آف کمپنیز" میں لے گئے۔

اُڑتی ہوئی مٹی کو پھر قرار آگیا۔ قرار آجائے تو اسے بے قرار کون کہے گا۔ گھر کا سامان پھر بندھنے لگا۔

"ہمارے میاں نے فلیٹ خرید لیا۔"

نارتھ کراچی میں ناگن چورنگی کے قریب کوہ نور پلازا میں اس نے فلیٹ خرید لیا تھا۔

ان دونوں یہ علاقہ بالکل اُجاڑ پڑا ہوا تھا۔ فلیٹ بھی کوئی خاص نہیں تھا لیکن شہناز کو یہ خوشی تھی کہ کرائے کی لعنت سے تو نجات ملی۔ انہوں نے اپنا گھر تو کیا۔ جمال بھی خوش تھا کہ اس نے بیوی بچوں کو مستقل ٹھکانا دے دیا۔

اس کا یہ گھر ذرا دور تھا لہٰذا میں بہت دن تک نہ جاسکا۔ ایک دن سوچا تشنہ بھائی سے بھی ملاقات ہوجائے گی' جمال بھی وہیں ہوگا۔ میں اس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا' وہ پرندہ تو یہاں سے کب کا اُڑ گیا۔ چلو' یہ نوکری بھی گئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں کوہ نور پلازا جاکر اس سے ملوں۔

اس نے اس ویرانے میں بھی کئی شاعر دریافت کرلیے تھے۔ عزم بہزاد' لیاقت علی عاصم' جاوید صبا اور سب سے بڑھ کر سید امروہوی جو اس سے اتنی محبت کرنے لگے تھے کہ اس کے گھر کا سودا سلف تک خود لے کر آتے تھے۔

"بس اس علاقے میں ایک خرابی ہے۔" جمال نے کہا "نیو کراچی یہاں سے قریب ہے۔ خدا عزتِ سادات کی حفاظت کرے۔ وہاں کے شعرا میرا گھر نہ دیکھ لیں۔"

میں پہنچا تو بہت دن بعد اس نے اپنی شاعری کی بات کی۔ دو غزلیں بھی سنائیں۔ جب میں نے کہا' یہ غزلیں وہ پہلے بھی سنا چکا ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اس کا مطلب ہے میں نے تقریباً سال بھر سے کوئی غزل ہی نہیں لکھی۔ میں بھی کہاں ضائع ہوتا رہا۔ لعنت ہے۔"

اس نے طے کیا کہ ہم روز ملیں گے اور روز شعر کہیں گے۔ میں کم و بیش روز وہاں جانے لگا۔ وہ بڑی پابندی سے شعر لکھنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے اس بات پر تیار کرلیا کہ میں اپنی کتاب شائع کروں۔ نام بھی طے ہوگیا۔ ضروری اخراجات کی فہرست بھی تیار ہوگئی۔ میں نے اپنی بیاض اس کے حوالے کردی کہ وہ انتخاب کردے۔ اب لازماً مجھے وہاں روز جانا ہوتا تھا۔ جب انتخاب ممکن ہوگیا تو مسودہ کتابت کے لیے عزم بہزاد کے حوالے کردیا گیا۔

ابھی اس کے فلیٹ کی دیواروں کا رنگ بھی میلا نہیں ہوا کہ اسے فلیٹ بیچنے کی جلدی ہونے لگی اور اس نے فلیٹ بیچ دیا۔ کرائے کے مکان تو بدلتا ہی رہتا تھا' ذاتی مکان بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ سامنے اقبال پلازا تھا۔ اس نے یہاں کرائے پر فلیٹ لیا اور سامان منتقل کردیا۔

پیسے ہاتھ میں آئے تو اسے خرچ کرنے کی بھی سوجھی۔ پیسے زیادہ تھے اس لیے اس مرتبہ سوجھی بھی بڑی دور کی۔ وہ لندن چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ علیم اور شکیل عادل زادہ بھی ساتھ ہیں۔ خاندان میں افسوس کی لہر دوڑ گئی کہ جمال نے مکان بیچ دیا لیکن شہناز کو ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ کہہ کر گئے تھے کہ اس طرح ان کی شہرت پوری دنیا میں ہوجائے گی۔ مکان کا کیا ہے پھر ہوجائے گا۔

واپس آیا تو ساقی فاروقی کے قصے سناتا ہوا آیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ صرف اس سے ملنے لندن گیا تھا۔

کوہ نور پلازا کے نیچے ایک ہوٹل کھل گیا تھا۔ جمال نے اسے ٹھکانا بنایا اور ساری کشتیاں جلا کر یہاں بیٹھ گیا۔ اقبال پلازا سے اترتا' سڑک پار کرتا اور یہاں آکر بیٹھ جاتا پھر ملنے والے آتے رہتے اور بھیڑ لگ جاتی۔ رات کو کسی وقت اٹھتا' جیب میں ہاتھ ڈالتا' جو دن بھر کا حساب بنتا' ادا کرتا۔ سڑک پار کرتا اور اقبال پلازا کی سیڑھیاں چڑھ جاتا۔

شہر میں کوئی چمکتا ہوا شاعر نظر آتا' جمال اسے اس ہوٹل پر ضرور لے کر آتا اور ایسا خوش ہوتا جیسے کوئی موجد اپنی دریافت سے خوش ہوتا ہے۔ عزم بہزاد' لیاقت علی عاصم' جاوید صبا' جو روز ہی کے بیٹھنے والے تھے' دوسرے تیسرے دن امید فاضلی' نصیر ترابی' عبید اللہ علیم' مدیر رضوی وغیرہ بھی آجاتے تھے۔ مشاعروں کے دعوت نامے یہاں آنے لگے' ٹی وی پروڈیوسر شاعروں کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچنے لگے۔ جو کہیں نہ ملتا' وہ یہاں مل جاتا۔ جمال اس میلے ٹھیلے کا سرخنہ بنا ہوا تھا۔

۸۶ء میں میری کتاب بھی آگئی اور اس کی "رات کے جاگے ہوئے" بھی آگئی۔

اس کتاب میں اس کی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا تھا۔ وہ شاعری کے سفر میں آگے بڑھا تھا' پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ اب تک اس کی شاعری عشقیہ تجربات تک گھوم رہی تھی لیکن اس کتاب میں موضوعات کا اضافہ ہوا تھا۔ سوچنے کا عمل بڑھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ زبان و بیان پر گرفت زیادہ مضبوط ہوئی تھی۔ اس کا بنیادی مؤقف تو وہی کلاسیک تھا لیکن تازگی کا احساس برقرار رہا تھا بلکہ پر کاری چونکا دینے والی تھی۔ اب عمر بھی ایسی تھی کہ تجربات نے جذبات کی جگہ لے لی تھی۔

کراچی کے حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے

جارہے تھے۔ شام ہوتے ہی سڑکیں ویران ہونے لگی تھیں۔ آئے دن کرفیو لگنے لگے۔ وہ پاؤں توڑے گھر بیٹھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ۸۶ء کے ختم ہوتے ہوئے اس کے پائے ثبات کو لغزش ہوئی۔ وہ گھبرانے لگا۔

"یار، میں تو ان حالات میں ناگن چورنگی سے آگے بھی نہیں نکل سکتا۔ کسی سے قرض بھی پکڑوں تو کیسے پکڑوں۔ مجھے تو لگتا ہے، بس اب میں سڑک پر آجاؤں گا۔"

اس کا علاقہ خطرناک ہوگیا تھا۔ ہنگاموں کی وجہ سے میں بھی بہت دن تک اس کی طرف نہ جاسکا۔ ذرا من ہوا تو ڈرتے ڈرتے اس کی طرف چلا گیا۔ اتنے دن کی جان لیوا تنہائی نے اسے بہت تلخ کردیا تھا۔ وہ دوستوں کی شکایت پر اتر آیا تھا۔

"جب تک میرے پاس پیسے تھے، میں نے کسی کو جیب میں ہاتھ ڈالنے نہیں دیا۔ اب کوئی آکر یہ بھی نہیں پوچھتا کہ مجھ پر بیت کیا رہی ہے۔ کل شہر کی طرف نکلا تھا۔ کچھ پیسے ایک جگہ سے پکڑے ہیں۔ دیکھوں یہ کتنے دن چلتے ہیں۔ سوچ رہا ہوں یہ علاقہ ہی چھوڑ دوں۔ یہ تو ہنگاموں کا گڑھ بن گیا ہے۔"

میں بھی ان دنوں تھا تو دستگیر میں لیکن مکان بدل لیا تھا۔

○☆○

اس کی ملاقات سام مرزا سے ہوگئی۔ انہوں نے حالات کی ہوا دیکھ کر اس کی ترجمانی کے لیے سویرا کے نام سے اخبار نکالا تھا۔ وہ جمال کو اپنے اخبار میں لے آئے۔ جمال ایڈیٹر بن گیا اور ڈیلی کالم بھی لکھنے لگا۔ اسے پھر سہارا مل گیا۔

پھر سننے میں آیا کہ اس نے اقبال پلازا کا فلیٹ چھوڑ کر، نیپا چورنگی کے قریب مومن پلازا میں کرائے کا فلیٹ لے لیا ہے۔ اس مرتبہ وہ مکان تبدیل کرنے میں حق بجانب تھا۔ گلشن کا علاقہ ہنگاموں سے محفوظ تھا لہٰذا اچھا ہوا، وہ یہاں آگیا۔ میں ابھی تک اس کے اس نئے فلیٹ میں نہیں گیا تھا۔

ایک روز ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ وہ آگیا۔ میں سوچ رہا تھا، اتنی صبح وہ کیسے آگیا۔

"یار، آج کل میں بہت سویرے اٹھتا ہوں اور کئی میل پیدل چلتا ہوں۔ پیٹ بہت بڑھ گیا ہے یار۔ آج ٹہلنے کے لیے نکلا تو اس طرف منہ اٹھ گیا۔ سوچا جب چل ہی پڑا ہوں تو تجھ سے مل آؤں۔"

"نیپا چورنگی سے یہاں تک آگئے۔ یہ چہل قدمی تو نہیں ہے سزا ہوگئی۔" میری بیوی نے کہا۔

"ہاں، رضوانہ جی اب تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔"

"بیٹا، اب جاؤ بھی پیدل تب تو مزہ ہے۔"

"چل بے، جنید کو بھیج کر ٹیکسی منگا دے۔ اب تو کھڑے ہونے کی سکت بھی نہیں ہے۔"

جب ٹیکسی آہی گئی تو ہم نے سوچا ہم بھی اس کا یہ نیا فلیٹ دیکھ آئیں۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا اور ہم اس کے گھر چلے گئے۔

اس کا یہ گھر، دستگیر سے قریب تھا اس لیے میں پابندی سے جانے لگا۔

اب اس کے دوستوں میں سیاست دانوں اور صحافیوں کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ دن، رات سجا جمی رہتی۔ اب اس کے پاس خود سے ملنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ وہ اتنی تیز دوڑ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ اب میں تماشائی کی طرح اس کی ترقی کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی شہرتوں سے سرشار تھا۔ اس نے اتنے مشاعرے اپنے ملک میں بھی نہیں پڑھے ہوں گے جتنے بیرونِ ملک پڑھ آیا تھا۔ دو مرتبہ لندن اور گردونواح کے مشاعرے لوٹ چکا تھا۔ جشنِ جون ایلیا میں شریک ہوا۔ عرب امارات کا چپا چپا اس کے شعروں سے آباد ہوگیا تھا۔ اب وہ یہ کہنے میں حق بہ جانب تھا کہ دیکھا، میں اپنے ہم عصروں سے آگے نکل گیا کہ نہیں۔ میری خود غرضی یہ کہتی تھی کہ کاش وہ اتنا آگے نہ نکلا ہوتا، بس میرے ساتھ رہتا۔ کاش وہ کورنگی کا وہی سادہ لوح لڑکا رہتا۔ ترقی کے اس راستے میں اسے طرح طرح کے لوگ ملے اور اس پر طرح طرح کے رنگ چڑھتے گئے۔ سنورنے کے اس زمانے میں بگڑنے کے بھی کئی مراحل آئے۔ اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے بہت سے نادان دوست اسے ایک ایسی گلی میں لے گئے جہاں واپسی کا راستہ کوئی نہیں تھا۔ شام ہوتے ہی جیرۂ شب میں ایک ایسا دروازہ کھل جاتا جہاں نشہ تھا، دھواں تھا، لغزشیں تھیں اور وہ تھا۔ میں اپنے یار کو ان بلاؤں کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہا تھا مگر چپ تھا۔ چپ یوں تھا کہ ہوش آئے تو کہوں، خود کو سنبھالے تو کہوں۔ ایک دن ہمت کی بھی تو جواب یہ ملا کہ ساجد امجد، تم میرے دوست ہو، ناصح نہیں۔ اس کے دل میں ممکن ہے کہیں یہ بات بھی ہو کہ میں اس کی شہرت سے خوش نہیں ہوں۔

ایک آدھ سال بعد سویرا پر بھی زوال آنے لگا۔ جمال کو معلوم تھا، اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ بچاؤ کے لیے رستے تلاش کررہا تھا کہ انور فراز اسے ڈھونڈتا ہوا مومن پلازا پہنچ گیا۔

سسپنس ڈائجسٹ کے لیے مدیر کی ضرورت تھی۔ قرعۂ فال جمال کے نام نکلا تھا۔ معراج صاحب نے انور فراز کو اسی مقصد کے لیے اس کے پاس بھیجا تھا۔

"مگر میں تو سویرا میں کالم لکھ رہا ہوں۔" جمال نے کہا۔

"تو کیا ہوا، لکھتے رہو۔" فراز نے کہا۔

"معراج صاحب کو اعتراض نہیں ہوگا؟"

"وہ خالباً اس پر بھی تیار ہیں۔ تم اور بات کرکے دیکھ لو۔ ویسے کیا رکھا ہے کالم والم میں۔ چھوڑ دو تو اور اچھا ہے۔"

"اس خاکسار نے سویرا کو اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ دو چار کالم کے بعد خود ہی بند ہوجائے گا۔" جمال نے ایک جاندار قہقہہ

لگاتے ہوئے کہا۔

جمال تو آنے والی بے روزگاری کے عفریت سے بچنے کی راہ تلاش ہی کر رہا تھا۔ ضروری بحث و تمحیص کے بعد تیار ہو گیا۔

اس کا اندازہ درست ہی تھا۔ سویرا بند ہو گیا اور وہ مکمل طور پر سسپنس کے سپرد ہو گیا۔

غالب کو اپنے مقدر سے شکوہ یہ تھا کہ وہ جس کا قصیدہ لکھتا ہے، وہ زندہ نہیں رہتا۔ جمال کا معاملہ یہ تھا کہ وہ جس پرچے سے منسلک ہوتا، وہ بند ہو جاتا لیکن الف لیلہ، حریت اور سویرا کا حشر دیکھنے کے باوجود جب نصیر ترابی کے بھائی طالب ترابی نے "محاسبہ" کے نام سے اخبار نکالا تو غالباً نصیر ترابی کی یاد دہانی پر انہیں جمال احسانی یاد آیا۔ جمال کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ سسپنس سے منسلک ہو چکا تھا۔ اتنا مضبوط ادارہ وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے معراج صاحب سے بات کی اور توقع کے برخلاف اسے یہ اجازت مل گئی کہ وہ صبح کے وقت میں سسپنس آنے سے پہلے پہلے محاسبہ کا کام نمٹا سکتا ہے۔ اس کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو اچھا ہے۔

محاسبہ شام کا اخبار تھا لہٰذا علی الصباح اس کا کام نمٹا کر وہ سسپنس کے دفتر پہنچ سکتا تھا۔

ان دنوں وہ سخت محنت کر رہا تھا۔ ناروں کی چھاؤں میں طالب ترابی اسے لینے آجاتے۔ وہ ان کے ساتھ محاسبہ کے دفتر چلا جاتا۔ خبریں چیک کرتا، غلطیاں بنواتا، سامنے کھڑے ہو کر پیسٹنگ کراتا۔ ٹیلی فون گھماتا، اپنے تعلقات سے اخبار کو اشتہار دلواتا اور پھر سسپنس کے دفتر چلا جاتا۔ رات کو جو کہانیاں پڑھنے کے لیے گھر لے جاتا تھا، انہیں کمپیوٹر کے حوالے کرتا، ڈاک دیکھتا، کہانیوں کے عنوان سوچتا، ڈمی بناتا۔ دیگر مسائل نمٹاتا۔

انور فراز کی اس سے پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ اس کی فکشن کے شعبے میں مہارت کا بڑا قائل تھا۔ اسے ڈائجسٹ کا کیڑا کہتا تھا۔ اس لیے بھی محبت کرتا تھا کہ فراز، احمد جاوید کا دوست تھا اور حلقۂ ارباب ذوق کی نشستوں کے زمانے سے دونوں میں رسم و راہ تھی۔ دوپہر کا کھانا دونوں دفتر میں ساتھ کھاتے تھے۔ قیلولہ کرنے کی عادت اس نے یہاں بھی نہیں چھوڑی تھی۔ کھانے کے بعد قالین پر لوٹ لگاتا اور کچھ دیر کے لیے سو بھی جاتا۔ معراج صاحب کی انتظامی سختیوں میں اتنے ٹھاٹ وہی کر سکتا تھا۔ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا معراج صاحب کی کمزوری ہے۔ انہوں نے اس کی قدر بھی کی، ناز بھی اٹھائے۔

قیلولہ کرنے کے بعد وہ اٹھتا، چائے پیتا اور فراز کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ یہ اس کے باغ و بہار ہونے کا وقت ہوتا تھا۔ فراز کی دلچسپ باتیں اور جمال کے قہقہے اور پھر جمال کے لطیفے، فراز کی تابڑ توڑ ہنسی۔ سب کو معلوم ہو جاتا، اس وقت جمال اپنے کمرے میں نہیں۔

ان دنوں دو ہی تذکرے اس کی زبان پر رہتے۔ جب ملتا، معراج صاحب کی فیاضی کا ذکر کرتا یا پھر انور فراز کی پیشہ ورانہ مہارت کا۔ اس کے حافظے کی داد دینا کہ اسے کیسے کیسے خراب شاعروں کے شعر بھی زبانی یاد ہیں۔

جمال کی عادت تھی کہ وہ جہاں ہوتا، چاہتا کہ اس کے دوست بھی ہوں۔ اس طرح وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا اکیلا پن دور ہو گیا۔ اس نے قدم جما لیے تو چاہا کہ میں بھی منسلک ہو جاؤں۔

"یار، شاعری میں کیا رکھا ہے۔ کہانیاں لکھ اور پیسے کما۔" اس نے مختلف رائٹروں کی مثالیں دیں کہ کون کتنا کما رہا ہے۔

"مگر میں نے تو آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی۔"

"لکھو تو۔ میں نے تمہاری نثر دیکھی ہے، تم لکھ سکتے ہو۔"

اس نے یہ باتیں میری بیوی کے سامنے کی تھیں۔ بات معاوضے کی بھی تھی لہٰذا اس کے جانے کے بعد بیوی نے میری جان کھالی اور مجھے لکھنا پڑا۔ ایک صفحہ لکھنے کے بعد مجھے خود محسوس ہوا کہ میں لکھ سکتا ہوں۔ جب یہ کہانی انور فراز نے بھی پسند کی تو میری ہمت بڑھی اور میں مستقل لکھنے لگا۔

اسی طرح وہ غلام قادر کو بھی لے کر آیا۔ اس کا معاملہ مجھ سے بھی مختلف تھا۔ میرا کچھ تعلق تو تھا لکھنے سے، غلام قادر کا تو کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ جمال نے اس سے بھی کہانیاں لکھوالیں۔

ایک قدم تنگی پر ہے اور دوسرا پانی میں
ساری عمر بسر کردی ہے نقلِ مکانی میں

مکان اور نوکریاں تبدیل کرنا اس کا مشغلہ سا بن گیا تھا۔ کبھی نوکری پہلے بدل لیتا، کبھی مکان۔ اس مرتبہ نوکری تو وہی رہی مکان بدل لیا۔ ابھی سسپنس ہی میں تھا کہ مومن پلازا چھوڑ دیا۔ اس مرتبہ اس نے خاندان والوں کو حیران کردیا۔ جمال نے فلیٹ خرید لیا۔ وہ مومن پلازا سے الٰہ نور پلازا، ابوالاصفہانی روڈ پر منتقل ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر یقین آگیا کہ اس کی بے چین روح کو قرار آجائے گا۔

اس مرتبہ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی ورنہ پہلے نوکری ہی بدلتا۔ بہرحال مکان بدل لیا تو نوکری بدلنے کا خیال آگیا۔

اسے ایک فنانسر مل گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا، ایک ڈائجسٹ نکالا جائے۔ جمال کئی دن اس پیش کش پر سوچتا رہا اور بالآخر اس نے طے کرلیا کہ وہ ڈائجسٹ نکالے گا۔ اس نے انور فراز کو راز دار بنایا۔

"اب میں یہ نوکری چھوڑ دوں گا یا سمجھو چھوڑ دی۔" اس نے اپنا منصوبہ بتانے کے بعد انور فراز سے کہا۔

"نادانی مت کرو۔ تم آدمی ذہین ہو، ڈائجسٹ نکال بھی سکتے ہو۔ ضرور نکالو لیکن معراج صاحب کے علم میں لے آؤ۔ یوں چپکے سے الگ مت ہو۔ واپسی کا راستہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کوئی اور مفید مشورہ دیں۔"

بات کبھی کبھی اس کی سمجھ میں آبھی جاتی تھی۔ اس نے معراج صاحب سے بات کرلی۔ ظاہر ہے انہیں کیا کہنا تھا۔ انہوں نے یہی کہا کہ اچھا ہے' تجربہ کرلو۔

وہ جب کسی کام کا آغاز کرتا تھا تو ایسی سرگرمی دکھاتا تھا کہ پہاڑ کو چٹکیوں سے مسل دے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کام سے اکتا جاتا تھا۔

وہ اس وقت ایسا ہی خوش تھا۔ مجھ سے ملا تو مجھے یاد دلایا۔

"تجھے یاد ہے' جب ۷۸ء میں ملالہ سے آیا تھا تو میں نے تیرے گھر کے پچھواڑے میدان میں ٹہلتے ہوئے تجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے میرے بھائی کچھ سرمایہ قرض دے دیں تو میں ڈائجسٹ نکالوں۔"

"مجھے کچھ یاد تو آرہا ہے۔"

"انہوں نے مجھے قرض نہیں دیا تھا۔ سوچتے ہوں گے' میں پیسے ڈبو دوں گا۔ وہ خواب اب جاکر پورا ہوا ہے۔ میں ڈائجسٹ نکال رہا ہوں۔"

اس نے مجھے فہرست دکھائی۔ یہ ان رائٹروں کے نام تھے جن کو وہ اپنے ڈائجسٹ میں لکھنے کے لیے مجبور کرچکا تھا۔

"میں چاہتا ہوں' کچھ نام ایسے بھی ہوں جن کے ساتھ کسی ڈائجسٹ کا لیبل نہیں لگا ہوا ہے۔ انور مقصود' اصغر ندیم سید...... دیکھ رہا ہے تو۔"

"فہرست تو خیر ٹھیک ہے لیکن اس ڈائجسٹ میں تم بھی تو ہوگے۔"

"ظاہر ہے۔ میں تو نکال ہی رہا ہوں۔"

"بس یہی گڑبڑ ہے۔ ساری فہرست ایک طرف' تم ایک طرف۔ طرفہ تماشا یہ کہ نصیر ترابی بھی ہیں تمہارے ساتھ۔"

وہ ناراض ہوگیا "کیا سمجھتے ہو تم۔ میں کام نہیں کرسکتا۔ سب یہی کہتے ہیں مگر تو تو مجھے جانتا ہے۔ تجھے تو معلوم ہے میں کتنا محنتی آدمی ہوں۔"

"محنتی تو ہو مگر یہ دوپہر میں سونا۔"

"ابے اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں دوسروں سے زیادہ کام کرسکتا ہوں۔"

اس نے سسپنس چھوڑ دیا تھا اور دن رات "رازدار" کے لیے کہانیاں جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کم از کم چھ مہینے کا مکمل میٹر' تیار حالت میں میرے پاس ہو۔"

اس دن کے بعد سے بس رازدار کی باتیں تھیں' اپنے عزائم تھے' اپنے رائٹروں کی تعریفیں تھیں اور وہ تھا۔

ستمبر ۱۹۹۲ء میں پہلا رازدار آگیا۔

ابتدائی چند پرچے اسی آب و تاب سے شائع ہوئے جو اس کے عزائم سے جھلکتی تھی لیکن پھر صاف ظاہر ہونے لگا کہ محنت نہیں کی جارہی ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ اس کے تعلقات نے اس کے ڈائجسٹ کو اشتہاروں سے بھردیا۔

یہ اس کی خوش حالی کے دن تھے۔

وہ اِدھر اُدھر مشاعرے پڑھتا پھر رہا تھا۔ ملک میں بھی اور ملک سے باہر بھی۔ ہندوستان سے مشاعرے کی دعوت آئی تو بہت خوش تھا۔

"یار' پانی پت بھی جاؤں گا۔ اپنے رام پور والوں سے کہو میرے اعزاز میں مشاعرے کرائیں۔ تمہارا رام پور بھی دیکھ آؤں گا۔"

بارہ بنکی' لکھنؤ' دِلّی' پانی پت میں مشاعرے پڑھ کر لوٹا تو بقول اس کے' اب اس نے مشرق و مغرب ایک کردیے تھے۔

رازدار کی سالگرہ آگئی تھی۔ اس نے اس سالگرہ کو منانے کے لیے بڑے پروگرام بنائے تھے۔ کون سے سبزہ زار میں تقریب ہوگی' کتنے مہمان ہوں گے' رائٹرز کو کس قسم کے تحفے دیے جائیں گے۔ تاریخ آئی اور چلی گئی پھر ایک اور تاریخ طے ہوئی۔ وہ بھی گزر گئی۔ سالگرہ تو نہیں ہوئی' رازدار مشکلات کا شکار ہوتے ہوتے بند ہوگیا۔

"میں یہ فلیٹ بیچ رہا ہوں۔" ایک دن اس نے کہا۔

"کیوں بھائی۔ اب کیا وحشت ہے؟"

"یار' گلشن کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ زندگی تو کلفٹن پر ہے۔ اب وہیں رہیں گے یار۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہاں کا معیار زندگی اور اخراجات۔"

"تو اپنے یار کو سمجھتا کیا ہے۔ میں تو مشاعروں ہی سے اتنا کما سکتا ہوں کہ اپنے بچوں کو باعزت زندگی دے سکوں۔ یہ جمال احسانی کے بیٹے ہیں یار۔"

اب تک اس کے تمام راستے بڑا شاعر بننے کی طرف جاتے تھے۔ اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ بڑا شاعر بن چکا۔ اب وہ بڑا آدمی بننے کے منصوبے پر عمل کررہا تھا۔

اس نے کوہ نور پلازا والے فلیٹ کی طرح یہ فلیٹ بھی فروخت کردیا اور کلفٹن کے سینڈز اپارٹمنٹ میں' ساحلِ سمندر کے نزدیک ایک آئیڈیل فلیٹ کرائے پر لے لیا۔

میں اس کے نئے فلیٹ پر گیا تو گھر کی آرائش' بچوں کے ترو تازہ چہرے اور شہناز کی خوشی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس پھلواری میں جمال کے مضبوط ارادوں پر مجھے فخر ہوا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے کتنی محنت کی ہے' یہ سوچ کر مجھے فخر ہوا تھا۔ ایک شاعر سے دنیا اور کیا توقع رکھتی ہے۔ اس نے دونوں محاذوں پر کتنی خوب صورت جنگ لڑی ہے۔ وہ بلاشبہ ایک کامیاب آدمی ہے۔

اس نے اپنا کمرا بند کیا۔ الماری سے بوتل نکالی' گلاس وہ پہلے ہی لے آیا تھا۔

"یار، تجھ سے بس ایک ہی شکایت ہے۔ تُو میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"میں تیرے ساتھ بیٹھا تو ہوں۔"

"یار، ایک تُو بھی لے۔ یہ کلفٹن ہے یار، گلشن نہیں ہے۔ میں بچوں کا پیٹ کاٹ کر نہیں پی رہا ہوں۔"

اتنی دیر میں مجھے پیش کرنا بھول گیا۔ میں نے شکر ادا کیا۔ وہ اگر ضد کرتا تو میں مجبور ہو ہی جاتا۔

جب تک بیٹھا رہا، غزلیں سناتا رہا۔ وہ شاعری کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔

اس دوران میں شہناز کئی مرتبہ آئی اور ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ رکھ کر واپس چلی گئی۔

○☆○

وہ اپنے کسی دوست کی اسٹیٹ ایجنسی میں بیٹھنے لگا تھا۔ غالباً وہ اپنے لیے کسی راستے کا انتخاب کر چکا تھا اور اب تجربے کے ہتھیار جمع کر رہا تھا تاکہ جب بھی مناسب وقت آئے، وہ میدان میں اتر جائے۔

یہ مناسب وقت بالآخر آ گیا۔ یہاں بھی اس کی شاعری ہی کام آئی۔ اس کی ایک پرستار جو کبھی اس سے اس کے لڑکپن میں ملی تھی، بیرون ملک میں کچھ برس گزار کر واپس آئی۔ اسے پھر جانا تھا۔ وہ اپنی پچھلی محبت کی تلاش میں نکلی۔ اس شہر میں جمال کا پتا ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا۔ اس نے فون کیا اور جمال نے اسے ایک جگہ بلا لیا۔ ایسے خوب صورت دوستوں کے لیے اس کے پاس بہت سے ٹھکانے تھے۔

"جمال، یہ تم ہو؟" اس کی دوست کو ہنسی آ گئی "اتنی چربی چڑھالی۔ معلوم ہوتا ہے کھانے کا شوق اب بھی اسی طرح ہے۔"

"کہہ چکیں؟" جمال نے کہا "یہ چہرہ پہلے ایسا ہی تھا؟ تم بھی تو کتنی بدل گئی ہو۔"

"سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ہی بدل گئے ہیں لیکن دل نہیں بدلے، بس یہی بہت ہے۔"

"کیا کر رہے ہو آج کل؟"

جمال نے جواب میں اپنا یہ شعر پڑھ دیا

جمال معرکۂ رزق ہو کہ عشق کی جنگ
مجھ ایک شخص کو دونوں محاذ پر رہنا

"عشق تو خیر ٹھیک ہے، کسی سے بھی کرو لیکن معرکۂ رزق میں کہاں مصروف ہو۔"

"تم ہنسو گی۔"

"نہیں ہنسوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہو گے تاکہ نہاری کا ہوٹل کھول لیا ہے۔"

"ہوٹل تو نہیں، ایک اسٹیٹ ایجنسی ہے، اس پر بیٹھتا ہوں کچھ کمیشن کے بدلے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ایک شاعر اور یہ کاروبار۔

"جب تمہیں یہی کرنا ہے تو اپنی اسٹیٹ ایجنسی خود کھولو۔ مجھے اچھا نہیں لگا کسی کے ساتھ تمہارا بیٹھنا۔"

"اس کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"کتنی رقم میں کام چل جائے گا؟"

"دو لاکھ روپے میرے پاس ہوں تو میں آج دفتر کھول کر بیٹھ جاؤں۔"

"میں پرسوں جا رہی ہوں۔ جاتے ہی تمہیں ڈرافٹ بھیج دوں گی۔ کبھی ہو سکیں تو واپس کر دینا اور اگر ڈوب جائیں تو یہ تم سے بڑی رقم نہیں ہے۔"

اسے یقین نہیں تھا کہ وہ وعدہ وفا کرے گی لیکن اس کا ڈرافٹ آ گیا۔ اس نے پہلی فرصت میں زمزمہ، کلفٹن پر ایک فلیٹ کرائے پر لیا، میز کرسیاں ڈالیں اور اسٹیٹ ایجنسی کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ جو کام کرتا تھا، کامیابی ضرور ہوتی تھی، یہ الگ بات کہ اس کی بے اعتدالیاں کامیابی کو ناکامی میں بدل دیں۔ اس کاروبار میں جس لفاظی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی اس میں موجود تھی لہٰذا تھوڑے ہی دن میں ایک دو سودے ایسے ہو گئے کہ وہ مطمئن ہو گیا۔ اب اس کے پاس گاڑی بھی تھی، ڈرائیور بھی۔

اس نے سوچا، اب کام چلے گا تو اسے پھیل کر لیٹنے کی فرصت نہیں ملے گی۔ اس نے ایک ورکنگ پارٹنر رکھ لیا۔ خود شاعری میں مصروف ہو گیا، کام پارٹنر نے سنبھال لیا۔ جب جی چاہتا چلا جاتا ورنہ گھر سے مشورے بھیجتا رہتا۔ کاروبار پھر بھی چلتا رہا۔ منافع کا ساٹھ فیصد جمال کو ملتا رہا۔

اب اس نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ ایچ اقبال بھی یہیں تھے، شکیل عادل زادہ بھی اور انور مقصود بھی قریب۔ اور دوستوں کو بھی تلاش کیا جائے۔ جو یہاں نہیں ہیں، وہ ملنے تو آ سکتے ہیں۔ شاعر ناشاعر کی قید نہیں۔ دوست ہوں اور اچھے ہوں۔ آوازوں سے گھر بھر گیا۔ دعوتیں ہونے لگیں، لمحے جھکنے لگے، قدم بہکنے لگے۔ راتیں دن بن کر جاگنے لگیں۔ وفا شعار بیوی پکا پکا کر تھک گئی تو خانساماں آ گیا۔

اس کی انتہا پسند طبیعت نے ضبط کے سارے بندھن ایک جھٹکے سے توڑ ڈالے۔ کوئی اس کے ہاں نہ آیا تو وہ اس کے گھر پہنچ جاتا۔ پذیرائی اس کا مقدر تھا، جہاں جاتا پلکوں پر بٹھایا جاتا، آنکھوں سے لگایا جاتا۔ وہ صرف جمال تو نہیں تھا، شاعر بھی تھا۔ اس کی غزلیں ان محفلوں کی روح بن گئیں۔ اس کے صاحب حیثیت پرستار اس کے اشارہ ابرو کے منتظر رہتے۔ اس کی پیاس بجھتی بھی رہی، بڑھتی بھی رہی۔

اب وہ کسی محفل میں مجھے مل جاتا تو میرا جمال نہ ہوتا۔ میں اسے دوسروں کے نرغے میں، اجنبیوں کی طرح دیکھتا۔ وہ بڑھ کر

فادر آف امریکن لٹریچر

امریکی ادب دنیا کا بہترین ادب سمجھا جاتا ہے۔ فکشن کے میدان میں اس کا مقابلہ کوئی اور ملک نہیں کر سکتا۔ لاتعداد ادیب امریکا سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانوی ادب میں او ہنری، ہیمنگ وے، براڈبری، سلاسر، بلاخ اور ڈی ہاک کے نام ہمارے سامنے ہیں۔ رائس بروز کو بھی سب جانتے ہیں جس کی کتاب "ٹارزن" کسی زمانے میں انجیل کے بعد دنیا کی دوسری سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب تھی اور ان لوگوں کی بات الگ ہے جن کی کتابیں بیسٹ سیلر کہلاتی ہیں۔

تو اس شخص کی اہمیت کا اندازہ کیجیے جسے امریکی افسانے کا موجد کہا جاتا ہے۔

اسے فادر آف امریکن لٹریچر بھی کہتے ہیں۔

یہ شخص ۱۷۸۳ء کو نیویارک میں پیدا ہوا۔ ماں باپ سے اتنا لاڈ ملا کہ خراب ہوگیا اور تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گیا۔ کالج کی سطح تک پہنچ ہی نہ سکا۔

پھر ان حضرت نے محبت شروع کر دی۔

محبت نے ادیب بنا دیا۔ چند غیر منطقی سے مضامین ۱۸۰۴ء میں لکھے جو اس نے ایک قلمی نام "اولڈ اسٹائل جنٹ" کے تحت لکھے۔ یہ مارننگ کرانیکل نامی جریدے میں شائع ہوئے۔

اس عرصے میں عقل آگئی تھی۔ قانون کا امتحان پاس کر ڈالا اور وکیل بن گیا۔

مگر تھے تو یہ قدرتی رائٹر سو ساری دلچسپی ادب میں رہی۔ انہوں نے سیموئل مچل کی کتاب "گلڈ بک ٹو نیویارک سٹی" کی پیروڈی، مذاق ہی مذاق میں لکھی اور شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا، ایسا مزاحیہ ادب تو امریکا میں پہلے لکھا ہی نہیں گیا تھا۔

پھر واشنگٹن میں قیام کیا اور نظموں کا ایک مجموعہ چھپوایا۔ نظمیں نہیں چلیں تو دل برداشتہ ہو کر فوج میں چلا گیا۔ لندن میں اس کی ملاقات مشہور رائٹر سر والٹر اسکاٹ سے ہوئی۔ یہاں اس کی ترغیب پر اس نے تیس افسانوں کی ایک کتاب لکھی۔ یہ بڑی... کم یاب کتاب ثابت ہوئی۔ اس کی بہت سی کہانیاں مثلاً "اپ وان ونکل" اور "لیجنڈ آف سیلپی ہولو" وغیرہ اتنے زمانے بعد بھی روزِ اوّل کی طرح مشہور ہیں۔ پھر اس نے نئے موضوعات کی تلاش میں سیاحی شروع کی۔ دنیا کے بہت ملکوں میں گھوما۔ پیرس میں ڈرامے اور اوپرا وغیرہ کے چکر میں بھی رہا۔ اسے اسپین میں امریکیوں کا نمائندہ بنا دیا گیا۔ اس جگہ اس نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کا مطالعہ کیا اور دو یادگار کتابیں لکھیں جو فرضی تاریخی کہانیوں کی تھیں اور جن کا پس منظر ہسپانوی مسلم شاہی دور تھا۔ "غرناطہ کی فتح" اور "الحمرا"۔

بے شک اس کی تحریریں آج کے جدید عصری فکشن کے مطابق نہیں۔ لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے امریکا میں فکشن کی تخلیق کی داغ بیل ڈالی۔

اس کا انتقال ۱۸۵۹ء میں اپنے ہی وطن میں ہوا۔

اس موئد جدیدیت کا نام ہے۔ واشنگٹن ارونگ۔

تلاش۔ احمد صغیر صدیقی

مجھے گلے لگاتا مگر گلے تو وہ سب ہی کو لگاتا تھا۔ میں سوچتا تھا، اس کی ہر بات پر واہ واہ کہنے والے اس کے دوست ہیں یا دشمن!

اس کی بے اعتدالیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ اخراجات آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔

اس کا مٹاپا برقرار تھا لیکن صحت بگڑنے لگی تھی۔ وہ ان باتوں کی پروا کرنے والا کب تھا لیکن شہناز کو فکر ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹروں کے پاس خود جاتی، حال کہہ کر دوا لاتی، وقت سے پلاتی۔ ٹھیک ہو جاتا تو سمجھاتی لیکن کسی قسم کا پرہیز اس کے مسلک میں حرام تھا۔

ایک مرتبہ اسے جانڈس ہوا۔ علاج کے بعد کچھ افاقہ ہوگیا لیکن ڈاکٹروں نے سختی سے پرہیز کرنے کو کہا تھا۔ وہ مان گیا تھا کہ پرہیز کرے گا۔

"چلو ساجد کے گھر چلتے ہیں۔ گھر میں رہوں گا تو کچھ نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا رہے گا۔"

وہ میرے گھر آگیا۔ شہناز ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد دوا کی کوئی پڑیا اس کے منہ میں ڈال کر اسے پلا دیتی تھی۔

"شہناز' چھینک دلا دو۔ شہناز انگلیاں چٹخا دو۔ یار' ذرا ہاتھ تو دبا۔"

وہ باتیں کرتا رہا اور شہناز کو خدمت میں لگائے رہا۔ ایک بجے کے قریب اس سمیت ہم سب سو گئے۔

اس نے رات ہی کو کسی وقت دیکھ لیا تھا کہ فریج میں پاپلیٹ مچھلی رکھی ہے۔ وہ بستر سے اٹھا اور میرے بڑے بیٹے جنید کو اٹھایا۔

"یار' دونوں مل کر مچھلی تلتے ہیں۔ تو بھی کھانا' میں بھی کھاؤں گا۔"

اسے کیا خبر کہ مچھلی ان کے کھانے کی نہیں ہے۔ وہ اٹھا' دونوں نے مچھلی تلی اور ہڑپ کر گئے۔

صبح میری بیوی نے دیکھا تو مچھلی غائب۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ مچھلی کہاں گئی۔

"رضوانہ باجی' یہ کرتے ہیں یہ۔ میں رات بھر انہیں دوائیں کھلاتی رہی اور انہوں نے میری محنت کا یہ صلہ دیا۔"

ایسا بے پرہیز تھا وہ۔

○☆○

یاد صدیقی نو سال بعد جدہ سے آیا تھا اور ملازمت کی تلاش میں تھا۔ جمال نے اسے بھی اپنی ایجنسی میں رکھ لیا۔ یاد بھی میری طرح یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ جمال احسانی نہیں ہے' جسے میں چھوڑ کر جدہ گیا تھا۔

یاد کے آجانے سے شہناز کو بھی آسرا ہوا کہ سمجھانے والا کوئی تو آیا۔ یاد کی نصیحتیں بھی اکارت چلی گئیں۔

اس کی بے اعتدالیاں رنگ دکھانے لگیں۔ پہلے ذرا ئیور گیا پھر گاڑی گئی' نوکر چلا گیا۔ کوئی بات نہیں کاروبار میں ایسے مراحل آتے ہی رہتے ہیں۔ وہ بالکل مطمئن تھا۔ یار' اگر آمدن کم ہو رہی ہے تو کیا میں زندہ رہنا چھوڑ دوں۔

ملک کے سیاسی حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کاروبار ٹھپ ہونے لگے۔ جب غیر یقینی صورتِ حال ہو تو جائداد کون بیچے اور کون خریدے۔ کبھی کوئی سودا ہو بھی جاتا تو وہ ایسا تھا جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ جمال ایسے موقع پر بڑا چوکنا ہو جاتا تھا۔ وہ وقت سے پہلے خطرہ بھانپ لیتا تھا لیکن اس مرتبہ اس کی قسمت خراب تھی۔ ان حالات میں کانفٹن کی کئی اسٹیٹ ایجنسیاں بند ہو گئیں لیکن جمال ضد پر آگیا حالانکہ کبھی ہوش کے دنوں میں وہ خود کہا کرتا تھا کہ کاروبار میں ضد نہیں کرنی چاہیے۔

وہ بڑی آسانی سے کاروبار سمیٹ کر وہیں آسکتا تھا جہاں سے چلا تھا لیکن وہ ضدی بچے کی طرح مچل گیا۔ مکان کا کرایہ چڑھنے لگا' بجلی کے بل رکنے لگے۔

اب اس نے اپنے تعلقات کو آواز دی۔ قرض لے لے کر گھر اور دفتر چلانے لگا۔

ایک دن اچانک اس کا پیٹ پھولنا شروع ہو گیا۔ یہ بالکل نئی افتاد تھی۔ شہناز کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ڈاکٹر نجیب' جمال کا دوست تھا' اسے فون کیا۔ اس نے کہا انہیں فوراً عباسی شہید لے آؤ۔

اسے اسپتال لے جایا گیا۔ معلوم ہوا کہ پیٹ میں پانی بھر گیا ہے۔ سرنج کے ذریعے اسے نکالا جائے گا۔

پیٹ کا پانی نکال دیا گیا۔ وہ دوسرے دن گھر بھی آگیا لیکن اخبار میں خبر لگ چکی تھی لہٰذا دوستوں کا تانتا بندھ گیا پھر وہی مہمان داری۔

"شہناز' یہاں سے نکلو۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"ایسا کرتے ہیں کچھ دن کے لیے دفتر والے فلیٹ میں منتقل ہو جاتے ہیں پھر دیکھا جائے گا۔ کم از کم اس فلیٹ کے دس ہزار تو بچیں گے۔"

شہناز نے سر جھکا کر فیصلہ سن لیا۔ اس نے یہ طعنہ بھی نہیں دیا کہ تم اگر لٹاتے نہیں تو اتنا کمایا تھا کہ جس فلیٹ کو چھوڑ رہے ہو اسے خرید سکتے تھے۔

اس نے بڑے شوق سے خریدا ہوا سامان بڑی بے دلی سے بیچنا شروع کر دیا کہ جس فلیٹ میں وہ جا رہی تھی وہاں یہ سامان نہیں سما سکتا تھا۔

اس کا گھر' دفتر میں منتقل ہو گیا۔ لو' ایک نقلِ مکانی اور ہوئی۔

ایک دس ہزار بچ گئے تو کیا ہوا۔ باقی اخراجات تو وہی تھے اور اب تو بیماری کا خرچ بھی بڑھ گیا۔ قرض کا بار بڑھتا گیا۔ کوئی قرض خواہ بہت تنگ کرتا تو قرض لے کے قرض اتار دیتا۔ یہاں آنے کا بس ایک فائدہ ہوا تھا کہ دوستوں کا آنا کم ہو گیا پھر بھی اس کا حال یہ رہا کہ چور چوری سے جاتا ہے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔

پیٹ میں پانی پھر بھر گیا۔ پیٹ کا پانی پھر نکال دیا گیا۔ اب تو یہی خبریں تھیں۔

شہناز اس کے لیے زمین کا گز بنی ہوئی تھی۔ مولوی' حکیم' ڈاکٹر سب ایک کر ڈالے تھے۔

جب گھر میں پابندی لگ گئی تو اس کا ایک پرستار اسے بیچ لگژری لے جانے لگا۔ وہاں سے آتا تو شہناز منہ دیکھتی رہ جاتی۔

ایک مرتبہ وہ اسی پرستار کے بل بوتے پر چپکے سے گھر سے نکلا اور رات کو بھی نہیں آیا۔ یاد اسے ڈھونڈنے نکلا اور بالآخر دوسرے دن وہ بیچ لگژری میں مل گیا۔

ایسے وحشی کے لیے یاد صدیقی زنجیر بنا بیٹھا تھا مگر وہ رکا تو اس وقت رکا جب رکنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

اس کے ایک اور پرستار کا فون اسلام آباد سے آیا۔ وہ اس کی شاعری پڑھ کر متاثر ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اسلام آباد آکر

اس کا مہمان بنے۔ شہناز نے بھی سوچا اس طرح آب و ہوا کی تبدیلی ہو جائے گی۔ اس کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک تھی لہٰذا وہ بھی تیار ہو گیا۔ پرستار نے ٹکٹ بھیج دیے اور وہ دونوں بیٹوں کو چھوڑ کر بیوی بیٹی اور چھوٹے بیٹے کو لے کر اسلام آباد چلا گیا۔

پرستار کو کیا خبر تھی کہ اس کی حالت کیا ہے۔ اس نے تو اپنی محبت میں ہر وہ شے مہیا کی جو اس نے طلب کی۔ پرستار کو ہوش تو اس وقت آیا جب اس کے پیٹ کے ساتھ ساتھ اس مرتبہ اس کے ہاتھ پیروں میں بھی پانی بھر گیا۔ اس نے گھبرا کر ہاسپٹل میں داخل کرایا اور فرطِ عقیدت میں اپنی پیشانی اس کے پیروں پر رکھ کر بیٹھ گیا۔

جیسے ہی اس کی طبیعت بحال ہوئی' وہ کراچی آ گیا۔ ائرپورٹ پر اتر کر وہ سوچ رہا تھا' کہاں جائے۔ سیڑھیاں چڑھ نہیں سکتا تھا' گھر پہنچتا تو قرض خواہوں کا سامنا الگ کرنا پڑا۔ اس نے سوچا کہ کہیں دم لے کر کچھ سوچ لیا جائے پھر کچھ کریں گے۔ شہناز نے اسے سہارا دیا اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"گلشن۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"گلشن کہاں جائیں گے؟" شہناز نے پوچھا۔

"فاطمہ حسن کے۔" اس نے نحیف آواز میں کہا۔

فاطمہ اسے دیکھ کر سہم گئی۔ بادشاہوں کی طرح قدم اٹھانے والا ٹیکسی کا سہارا لیے کھڑا تھا۔

"فاطمہ' ہم تمہارے گھر کچھ دن ٹھہریں گے۔"

"اندر تو آؤ جمال۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ جب تک چاہو رہو۔"

وہ شہناز اور فاطمہ کے سہارے اندر آیا اور بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔

شہناز نے اس کی کیفیت سے فاطمہ کو آگاہ کیا اور فاطمہ نے ان کے رہنے کے لیے ایک کمرا خالی کرا دیا۔

○☆○

جمال کا پارٹنر تو پہلے ہی کاروبار کی حالت دیکھ کر الگ ہو گیا تھا' یاد صدیقی بھی وہاں اکیلا بیٹھ کر کیا کرتا جب کہ اسے یہ ڈر بھی ہو گا کہ قرض خواہ آ کر اس کا سر توڑیں گے۔ اس نے بھی دیواروں کو خدا حافظ کہا اور یہاں سے نکل گیا۔

○☆○

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی نے فون اٹھایا۔ آواز سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا "ہیلو۔ جمال! کہاں سے بول رہے ہو۔ اسلام آباد سے۔ ابھی بات کراتی ہوں۔"

میں نے دوڑ کر فون اس کے ہاتھ سے لیا "ہیلو۔ ساجد۔ جان میں جمال بول رہا ہوں۔ میں فاطمہ کے گھر سے بول رہا ہوں مگر رضوانہ جی کو مت بتانا میں کہاں ہوں۔ کسی دوست کو بھی نہیں۔ بس تم فوراً آ جاؤ۔"

میں نے فون رکھا اور فاطمہ کے گھر پہنچ گیا۔ واہ ری ہمت! وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا تھا البتہ آواز میں نقاہت تھی۔

"یار' میں اپنی کتاب کے پبلشر سے بات کر کے آیا ہوں۔ مسودہ یہ رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ایک نظر دیکھ لو۔ معراج صاحب اور مشتاق احمد یوسفی میرا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔"

میں وہ مسودہ لے آیا پھر اسے واپس کرنے گیا۔ اس طرح تین چار چکر لگ گئے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن وہ یہی کہہ رہا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اس کا جگر ناکارہ ہو گیا تھا اور گردے بھی متاثر ہوئے تھے۔

"یار' میری نئی کتاب کے لیے میرا خاکہ لکھ دے۔ میں کسی سے بھی لکھوا سکتا ہوں لیکن جتنا تو مجھے جانتا ہے کون جانتا ہو گا۔" اس نے کس حسرت سے کہا تھا۔

برا ہو ان مصروفیات کا کہ میں نے عدیم الفرصتی کا رونا رو کر اسے مایوس کر دیا۔

اس کے بھائی نے اس کے لیے گلستانِ جوہر میں ایک فلیٹ کا انتظام کر دیا اور وہ وہاں منتقل ہو گیا۔

ٹھیک ٹھاک منتقل ہوا تھا لیکن نئے فلیٹ میں پہنچ کر اس کی حالت بگڑ گئی۔ وہ پھر اسپتال چلا گیا۔

اس کا خون بدلا جا رہا تھا۔ سخت تکلیف میں تھا لیکن اس وقت بھی اس کا شاعر توانا تھا۔ یاد صدیقی اسے دیکھنے گیا تو اس نے نقاہت سے بھری آواز میں کہا۔

"یار' ابھی آنکھیں بند کیے پڑا تھا کہ ایک شعر ہو گیا' تو بھی سن لے۔"

صدحیف تجھے دھوپ میں چلتے ہوئے دیکھا
افسوس کہ ہم سایۂ دیوار نہیں تھے

رمضان کے دن تھے لہٰذا میں اسے دیکھنے نہ جا سکا۔ خبریں ملتی رہتی تھیں۔ خبریں امید افزا تھیں۔ حالت اب پہلے سے بہتر ہے۔ کسی نے اونٹنی کا دودھ بتایا ہے۔ اس سے اسے اب بہت فائدہ ہے۔ اب حکیم کا علاج ہو رہا ہے۔ ہومیو پیتھک نے بہت فائدہ کیا۔

اس دوران میں وہ کئی مرتبہ اسپتال گیا اور واپس آ گیا۔ یہاں تک کہ سات فروری کی شام میں اسے دیکھنے گلستانِ جوہر گیا' میری بیوی' میرا سالا اور اس کی بیوی جو جمال کی سالی ہے' بھی میرے ساتھ تھے۔

جمال کی حالت وہی تھی جس کے لیے کہتے ہیں' چراغ بجھنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے پہلے بھڑکتا ہے۔ اس کی آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ کمزور بہت ہوگیا تھا لیکن مزے لے لے کر ان کوششوں کا مذاق اڑاتا رہا تھا جو شہناز اس کے علاج کے لیے کررہی تھی۔

"یار ساجد، میں ذرا ٹھیک ہوجاؤں پھر تیرے گھر رہنے آؤں گا۔" اس نے کہا پھر بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اچانک سنجیدہ ہوگیا۔ میری بیوی سے کہا "رضوانہ جی، حرا کے لیے کوئی لڑکا دیکھو۔ اب میں چاہتا ہوں اس کی شادی کردوں۔"

میری بیوی نے وعدہ کیا۔ وہ بہت دیر تک اپنی کتاب کے بارے میں گفتگو کرتا رہا پھر اس تحریر کے اقتباس سنائے جو اس نے اپنے بارے میں لکھی تھی۔

ہم مطمئن ہوکر اس کے پاس سے اٹھ آئے۔

دوسرے دن وہ صبح ہی سے ضد کرنے لگا کہ وہ خود بازار جائے گا اور حرا کے لیے صندوق لے کر آئے گا تاکہ اس کے جہیز کا سامان اس میں رکھا جائے۔

"تم کہاں جاؤ گے۔ تھک جاؤ گے۔ آجائے گا صندوق بھی۔"

"نہیں، میں اپنی بیٹی کے لیے خود جاکر خریدوں گا۔"

"پھر وہی ضد۔"

"میں گاڑی میں بیٹھا رہوں گا لیکن جاؤں گا ضرور۔"

اس کے دونوں بیٹوں نے سہارا دے کر اسے گاڑی تک پہنچایا اور وہ بازار پہنچ گیا۔ اپنی پسند کا صندوق لے کر آیا۔

"صندوق میں لے آیا ہوں، اب خالائیں اور پھوپیاں اسے بھریں۔" اس نے کہا اور سب ہنسنے لگے۔

ایک دن اور گزر گیا۔

دس فروری کی صبح اچانک اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ ندیم ہسپتال چونکہ قریب تھا لہٰذا اس کے گھر والے اسے پہلے وہاں لے کر پہنچے۔ ڈاکٹروں نے حالت دیکھ کر لیاقت نیشنل لے جانے کا مشورہ دیا۔ اسے وہاں لے گئے۔ اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ اسپتال میں ایمرجنسی کا سماں ہوگیا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ شہناز اس کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسے آئی۔ سی۔ یو میں لے جایا جارہا تھا۔ اچانک اس نے آنکھیں کھولیں، شہناز کی طرف حسرت سے دیکھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب بچھڑنے کی گھڑی آگئی۔

"شہناز، اب میں چلا۔ اب نہیں بچوں گا، تم گھر جاؤ۔"

"ٹھیک ہوجاؤ گے۔"

"نہیں میری جان۔ ایسا درد میرے کبھی نہیں اٹھا۔"

اسٹریچر نے دروازہ پار کیا اور ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔

"آپ اپنے رشتے داروں کو خبر کردیں۔ جسے دیکھنا ہو دیکھ لے۔ اب ان کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ ان کی بیگم کو گھر بھیج دیں تو اچھا ہے۔" ڈاکٹر نے اس کے بھائی سے کہا۔

ہلال حوصلے کی زبان لے کر شہناز کے پاس آیا "بھابی، پہاڑ ٹوٹنے والا ہے۔ آپ گھر چلی جائیں۔ آپ سے شاید یہ منظر نہ دیکھا جائے۔"

"کیا کہہ رہے ہو ہلال۔" شہناز اس پر برس پڑی "میں تمام زندگی ان کے ساتھ رہی ہوں۔ پل پل ان کی خدمت کی ہے۔ اب کہتے ہو گھر چلی جاؤں۔ وہ مجھ سے کہہ کر گئے ہیں کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ڈاکٹر مجھے کیا بتائے گا، تم مجھے کیا بتاؤ گے۔ میرا حوصلہ دیکھو۔ میں ابھی تک روئی نہیں۔"

وہ اندر گئی اور اپنے سہاگ کو آخری مرتبہ دیکھ کر باہر آگئی۔ آذر نے دیکھا۔ حرا نے آنسو پونچھ پونچھ کر اپنے باپ کو دیکھا۔ بچوں کی تکلیف پر بے تاب ہوجانے والا بے ہوشی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔

یکایک اس کی آنکھیں کھلیں۔ ایک جھٹکا سا لگا اور پھر منہ اور ناک سے خون جاری ہوگیا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

گھڑی اس وقت دوپہر کے ڈھائی بجارہی تھی۔ فروری کے مہینے کی دس تاریخ تھی۔

منزل پہ نگاہ جم گئی ہے
چلنے کی سکت نہیں رہی ہے

○☆○

اس کے نئے فلیٹ میں اس کی میّت رکھی ہوئی ہے۔ بہنیں پچھاڑیں کھا رہی ہیں۔ شہناز بے ہوش ہے۔ ایک طرف وہ صندوق رکھا ہے جو حرا کے بابل نے اس کے جہیز کے لیے خریدا تھا۔ ایک بے کس، بیمار باپ اس سے زیادہ اور دے بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے دوست اس کے قریب کھڑے آنسو بہا رہے ہیں۔ میں سرہانے کھڑا ہوں۔ یاد صدیقی پائنتی کی طرف ہے۔

اس کے آخری دن میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی شہرت سے جل گئے تھے۔ ساجد امجد! میرا دل مجھ سے کہتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے خودکشی پر مجبور کردیا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والے کم تھے، اسے بہکانے والے زیادہ تھے۔ بعض پرستاروں نے دوستی کے پردے میں اس سے دشمنی کی۔ اس کے تیز فقروں سے بچنے کے لیے اسے خاموش کردیا۔

پھر مجھے لگا، جمال نے کچھ کہا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو، میں اپنے دشمنوں کو پہچان گیا ہوں۔ تو فکر مت کر میرے یار۔

میں اپنے دوسرے پھیرے کے انتظار میں ہوں
جہاں جہاں میرے دشمن ہیں تاڑ آیا ہوں

●●